# پاکستان میں اردو کا المیہ

# ملاحظہ فرمایئے

سارے پاکستان میں سب زبانوں (یعنی انگریزی، اردو، بنگالی، عربی، گجراتی، پشتو، سندھی، فارسی) کے کل اخبارات اور رسائل کی تعداد ۸۰۵ ہے۔ ان میں اردو کے اخبارات اور رسالوں کی تعداد ۵۳۵ ہے۔ اردو کے اخبار اور رسالے ہر صوبے (پنجاب، سرحد، بلوچستان، مشرقی پاکستان) میں ہیں۔ اور بنگالی کے صرف بنگال میں ہیں اور کسی دوسرے علاقے میں نہیں اور ان کی تعداد کلہم ۸۲ ہے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں انگریزی روزنامے دو، بنگالی سات اور ارد پانچ ہیں۔

اردو جیسی ہمہ گیر زبان کے مقابلے میں بنگالی یا کسی دوسری علاقای زبان کو لانا سراسر نادانی اور نا فہمی ہے۔

# عرضِ حال

مجلس دستور ساز نے جب بڑے اطمینان سے بغیر کسی اُلجھن اور اختلاف کے لسانی مسئلہ کا فیصلہ کر دیا۔ تو کچھ دن تو لوگوں نے انتظار کیا اس کے بعد چاروں طرف سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ ہر ایک یہی پوچھتا تھا۔ "تو خاموش کیوں ہے ؟" بیشک میں خاموش تھا۔ حیرت نے مجھ پر خاموشی طاری کر دی تھی۔ میں جتنا غور کرتا تھا، حیرت بڑھتی جاتی تھی اور حیرت منہ پر مُہر لگا دیتی ہے۔

میں حیران تھا کہ مجلس دستور ساز میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو اس کے محرّک مؤید، مقرر، اسپیکر سب ایک سمت کے یعنی مشرقی بنگال کے تھے۔ دوسری سمت یعنی مغرب والوں میں سے نہ کسی نے تحریک کی نہ تائید کی نہ تقریر کی، نہ اتفاق کیا نہ اختلاف کیا۔

میں حیران تھا کہ " انتخاب ہفت کشور " کے سورماؤں نے کیوں دم سادھ رکھا تھا۔ سرحد کے شیر دل بہادر جو آن کی خاطر جان دینا اور جان لینا ادنا بات سمجھتے ہیں کس بھٹ میں گھُس گئے تھے۔ سندھستان اور بلوچستان کے جیوٹ معرکہ آرا کن کھوؤں اور ڈاروؤں میں جا چھپے تھے۔ نہ منہ سے بولتے تھے۔ نہ سر سے کھیلتے تھے۔ یہ زندہ لاشیں ایوانِ جمہوریہ اسلامیہ میں پڑی کیا کر رہی تھیں۔

میں حیران تھا کہ اُردو کے وہ جاں نثار اور پرستار، اپنی قومی زبان کے فدائی اور شیدائی جو اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے

اور اس کی حمایت میں ہمارے جلسوں اور کانفرنسوں میں آ کر اس زور سے دہاڑتے اور چنگھاڑتے تھے کہ لوگ اش اش کر جاتے تھے، کہاں چلے گئے تھے۔ ان کی زبان اور ہاتھ کیوں مفلوج ہو گئے تھے؟

میں حیران تھا کہ مسلم لیگ جس کے نعروں اور تقریروں نے ہندوستان بھر کو ہلا ڈالا تھا، جس نے تہذیب و زبان کے نام پر پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔ اور یہہ مطالبہ اس جوش و خروش اور قوت سے کیا تھا کہ ساری دُنیا میں اس کا غلغلہ مچ گیا تھا۔ یہ مسلم لیگ ہی تو تھی جس نے اُردو کو ہندوستان کی عام (یونی ورسل) زبان بنانے کی قرارداد پاس کی تھی۔ یہ اُردو ہی تو تھی جس نے لیگ کا پروپیگنڈہ اس زور شور سے کیا کہ اس کا پیغام گلی گلی اور گھر گھر پہنچ گیا۔ آج وہ کیوں نہیں بولتی۔ اس کے رہنما اور سردار کہاں گئے؟

میں حیران تھا کہ وہ علمائے کرام جن کی تحریر و تقریر، تصنیف و تالیف، جن کے فتاوے اور مناظرے، جن کے مجادلے اور مباہلے سراسر اردو میں ہوتے ہیں۔ اُردو کو ذبح ہوتے دیکھتے رہے اور ایک آنسو تک نہ بہایا۔ بلکہ حیرت اور صد ہزار حیرت ہے کہ ان میں سے بعض جو وقت کے "مزاج شناس" ہیں۔ بنگالے پہنچے اور شہر شہر اور قریے قریے بنگالی کی تبلیغ کرتے رہے۔ مداہنت اور مفاہمت ان پر ختم ہے۔

میں حیران تھا کہ قائد اعظم علیہ الرحمہ کی ہمشیرۂ عزیز محترمہ فاطمہ جناح جو قائدِ اعظم کی سچی جانشین ہیں اور جب کبھی قومی وقار پر آنچ آتی دیکھتی ہیں یا کسی بُنیادی اور حقیقی مسئلے سے انحراف ہوتا نظر آتا ہے تو تلملا اُٹھتی ہیں اپنے پُر جوش اور فصیح بیانات سے حکومت اور پبلک کو متنبہ اور سرزنش کرنے میں دریغ نہیں کرتیں۔ وہ اُردو کا خون ہوتے دیکھتی رہیں اور کچھ نہ بولیں۔ ایسے مسئلہ پر جس کی

خاطر قائداعظم جان کی بازی لگا کر ڈھاکے پہنچے تھے۔

میں حیران تھا کہ ہمارے بالغ نظر سیاست دان اور پختہ کار مُدبّر اور رہنما اکثریت کے نقطے سے کیسے دھوکا کھا گئے اور یہ نہ سمجھے کہ زبان کی اکثریت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہ کیسی اکثریت ہے کہ جسے اپنے گھر کے باہر اقلیت بھی نصیب نہیں بلکہ بمنزلہ صفر کے ہے۔ یہ کیسی اکثریت ہے کہ بنگال سے باہر نہ کہیں یہ بولی سمجھی جاتی ہے نہ لکھی پڑھی جاتی ہے اور نہ اس کے اخبار اور کتاب خانے ہیں۔ نہ اس کے مطبع ہیں۔ اور نہ بنگال سے باہر اس کا کوئی شاعر اور ادیب ہے۔ زبان میں اکثریت اور اقلیت کا مفہوم بالکل دوسرا ہے۔ مثال کے طور پر آپ انگریزی کو لیجئے۔ پاکستان میں جتنی زبانیں مروج ہیں اُن سب میں سب سے زیادہ اقلیت میں انگریزی ہے۔ یعنی اس کے جاننے والے فی صدی ایک سے بھی کم ہیں۔ لیکن باوجود اس انتہائی اقلیت کے تمام سرکاری دفتروں، عدالتوں، کارخانوں ڈاک خانوں، ریلوں، تجارت گاہوں، دوکانوں کے تختوں، یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں، کتاب خانوں میں اسی کا راج ہے۔ سب سے زیادہ مقبول اور معزز اخبار انگریزی کے اخبار ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ زیادہ تر انگریزی میں خط و کتابت کرتے ہیں۔ زیادہ تر انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اور اکثر اوقات آپس میں گفتگو بھی انگریزی میں فرماتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ اُردو کی طرح (اگرچہ اس سے کم) اس کے جاننے والے، پڑھنے والے، لکھنے والے پاکستان کے ہر علاقے اور ہر شہر میں موجود ہیں۔

میں اس کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں جس سے میرا مدعا پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ قدیم زمانے سے اہل فکر و حکمت کی یہ آرزو رہی ہے کہ کوئی جگت بھاشا یعنی عالمی زبان ہوتی تو ہمیں جو دشواریاں ایک دوسرے کے ادب، علمی

کمالات اور تحقیقات کے معلوم کرنے میں پیش آتی ہیں وہ نہ رہتیں اور کہیں بھی کوئی کتاب لکھی جاتی یا کوئی اختراع و ایجاد یا کوئی نئی تحقیق ہوتی تو دُنیا بھر میں سب کو معلوم ہو جاتی۔ اختلاف السنہ کی وجہ سے اب یہ ممکن نہیں کہ کسی خیال کا ترجمے کے ذریعے سے دوسروں تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی ہے۔ بعض ذہین اصحاب نے اس اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی اور ایسی زبانیں ایجاد کیں اور ان کو دُنیا میں رائج کرنے کے لئے بہت محنت کی اور بے شمار روپیہ صرف کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اب فرض کیجئے بعض جدّت پسند حضرات کو یہ خیال پیدا ہو کہ مصنوعی زبان خواہ کیسے ہی غور و فکر سے بنائی جائے جگت بھاشا نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا زندہ زبانوں میں سے کسی ایسی زبان کو انتخاب کیا جائے جو جگت بھاشا بننے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ ماہر لسانیات اور ماہر السنہ کی ایک کمیٹی بناتے ہیں اور وہ کمیٹی دنیا کے زبان والوں کو دعوت دیتی ہے کہ فلاں مقام پر فلاں تاریخوں میں زبانوں کے نمائندے جمع ہوں گے اور اس امر پر غور کریں گے کہ موجودہ مروجہ زبانوں میں کونسی زبان ایسی ہے جو عالمی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اتفاق رائے سے جو زبان اس کی اہل قرار پائے گی اُسے عالمی زبان قرار دیا جائے گا اور اُسے دُنیا بھر میں مروج کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

چنانچہ اس دعوت پر مختلف زبانوں کے نمائندے جنھیں یہ دعوا ہے کہ ان کی زبانیں اس کی اہل ہیں مقررہ مقام پر مقررہ تاریخوں پر جمع ہوتے ہیں۔ اس جلسے کی صدارت کے لئے ایک یہودی کا انتخاب کیا گیا۔ کیونکہ اس کی اپنی زبان دو ہزار برس پہلے فنا ہو گئی تھی۔ اس لئے خیال تھا کہ وہ کسی کی جانب داری نہ کرے گا۔ صدر نے اپنی تقریر میں جلسے کا مقصد بیان کیا جو بنی نوع انسان کی

بہبودی پر مبنی ہے۔ اور اختلاف السنہ سے انسان کو جو دشواریاں اور مصیبتیں پیش آئی ہیں ان کی وضاحت کی اور بابل کے مینار کا ذکر کیا جس کا تذکرہ توریت میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بابل کی سرکشی اور غرور کی وہ سزا نہیں تجویز فرمائی جوان حالات میں سابق کی اُمتوں کو دی گئی تھی یعنی اُن کو آگ برسا کر، بیماری پھیلا کر یا دریا کی طغیانی سے ہلاک نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت سزا یہ دی گئی کہ ان کی بولیاں بدل دیں جس سے اُن کا اتحاد جاتا رہا اور آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ اختلاف السنہ ایک عذاب الیم ہے جس سے نجات حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔

اس کے بعد صدر نے نمائندوں سے درخواست کی کہ وہ اپنی اپنی زبان کے حق میں جو دلائل رکھتے ہیں، بیان فرمائیں۔ سب سے اول فرانسیسی نمائندہ اُٹھا اور اُس نے بڑی فصاحت سے اپنی زبان کی خوبیاں بیان کیں اور کہا کہ فرانسیسی کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے۔ کُل مغربی یورپ میں ہر تعلیم یافتہ شخص فرانسیسی جانتا ہے۔ ترکی، ایران، مصر اور مشرق وسطیٰ میں فرانسیسی کا عام رواج ہے۔ کنیڈا میں ہر تعلیم یافتہ شخص فرانسیسی سے ضرور واقف ہے۔ انگلستان اور یورپ کے بعض دوسرے ممالک میں فرانسیسی تقریباً لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک صرف فرانسیسی بین الاقوامی زبان تسلیم کی جاتی تھی اور تمام سیاسی معاہدے اور صُلح نامے فرانسیسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ آج بھی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کی کُل کارروائی فرانسیسی اور انگریزی میں ہوتی ہے اگرچہ یہ ہالینڈ میں واقع ہے۔ اس کے بعد اس نے فرانسیسی زبان کی فصاحت و شیرینی اور قوتِ بیانیہ وغیرہ اوصاف پر بڑی پُرزور تقریر کی۔

اس کے بعد انگریز نمائندہ اُٹھا اور اس نے اپنی زبان کی عالمگیر حیثیت

پر تقریر شروع کی اور کہا اس وقت تمام دنیا میں انگریزی سے زیادہ مقبول کوئی
زبان نہیں ہے سلطنت برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ یورپ اور ایشیا کے تمام ممالک
میں انگریزی کا رواج عام ہے۔ جہاں پہلے فرانسیسی کا رواج تھا اب وہاں انگریزی
اپنے قدم جما رہی ہے اور اس کی مقبولیت اور ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اور کیا
ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس کی بعض نو آبادیات اور مقبوضات باوجود آزاد ہونے کے
اب بھی ان کی تعلیمی تہذیبی اور کاروباری زبان انگریزی ہے اور اپنی قومی اور مادری
زبانوں پر اُسے ترجیح دیتے ہیں۔ اور باہم اسی زبان میں مراسلت اور گفتگو کرتے ہیں
اور یہی زبان ان کے گھروں میں بولی جاتی ہے۔ ان کے اخباروں کو پڑھیئے جن میں
قومی زبان کے مقابلے میں انگریزی کی حمایت کی جاتی ہے۔ ان کے دستور کو ملاحظہ
فرمائیے جس میں انگریزی سرکاری زبان ہے۔ قومی زبان یوں ہی پڑی سسکا کرے گی
اور انگریزی برابر قائم رہے گی۔ یہ تمام باتیں اس نے بڑے فخر سے بیان کیں۔

اس کے بعد عرب کا نمائندہ اٹھا اور اس نے عربی زبان کی اکملیت اور افضلیت
پر بڑی فصیح اور پُرجوش تقریر کی کہ اس کی ظاہری اور باطنی محاسن کو دیکھ کر بعض ماہرین
لسانیات کو یہ کہنا پڑا کہ بلاشبہ یہ الٰہی زبان ہے۔ یہی زبان تھی جس نے یورپ کی صدہا
سال کی تاریکی کو مٹایا اور علم و فضل کی روشنی پھیلائی۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ کی
یونیورسٹیوں میں عربی کی تعلیم لازمی تھی کیونکہ بغیر اس کے علوم اور خاص کر سائنس کی تعلیم
ممکن نہ تھی۔ اب بھی عرب، مشرق وسطیٰ کے ممالک، مصر، سوڈان، شمالی افریقہ
کے ممالک کی قومی اور مادری زبان عربی ہے۔ علاوہ ازیں بھارت، پاکستان، ایران
انڈونیشیا، ملایا وغیرہ میں اب بھی یہ تعلیمی اور تہذیبی زبان ہے۔ اور ان ممالک میں
اس کے عالم، ادیب اور شاعر موجود ہیں۔ قدیم اور جدید السنہ میں یہی ایک ایسی
زبان ہے جو عالمی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔

اس کے بعد جرمنی، اٹلی، اسپین، ایران، بھارت وغیرہ کے نمائندوں نے اپنی اپنی زبان کے دعوے پیش کئے۔ ان کے بعد اُردو کا نمائندہ اٹھا اور اس نے کہا کہ اردو برعظیم بھارت و پاک کی مشترکہ اور عام زبان ہے۔ اور اس برعظیم سے باہر برما۔ عدن جدہ، مکہ، مدینہ، کربلا، نجف اشرف، بغداد، سیلون، انڈمان، فجی، برٹش گائنا، ٹرنی ڈاڈ، ویسٹ انڈیز، جنوبی اور مشرقی افریقہ، مارشیس، ملایا، انڈونیشیا وغیرہ تک جا پہنچی ہے۔ ایشیا اور یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں اور درسگاہوں مثلاً جاپان، ترکی، مصر، انگلستان، ماسکو، لینن گراڈ، مانٹریل (کنیڈا) وغیرہ میں اس کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ دُنیا میں بولنے والوں کی اکثریت کے لحاظ سے اس کا درجہ تیسرا ہے۔ اس میں سامی اور آریائی زبانوں کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ زبان کم سن ہے مگر ہونہار ہے۔ اس میں الفاظ کے جذب کرنے، نئے الفاظ بنانے اور ترقی کرنے کی بے پایاں صلاحیت اور امکانات ہیں اور ایک دن یہ بین اقوامی زبان ہو کے رہے گی۔

اس کے بعد دو تین اور نمائندوں نے تقریریں کیں۔ آخر میں چین کا نمائندہ اُٹھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بہت متانت سے کہا کہ آپ نے جو فصیح اور مدلل تقریریں فرمائیں وہ میں نے بڑے غور سے سُنیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو دلائل آپ نے اپنی زبانوں کے حق میں بیان کئے ہیں اُن میں بہت کچھ معقولیت پائی جاتی ہے۔ خصوصاً جس ڈھنگ سے اور جس حکمت اور ہوشیاری سے آپ نے اپنا اپنا مقدمہ پیش کیا ہے وہ داد کے قابل ہے۔ لیکن آپ اپنی زبانوں کے جوش محبت میں ایک کھلی اور بین حقیقت کو بھول گئے۔ آپ میں سے کسی نے بھی یہ خیال نہ کیا کہ وہ کونسی زبان ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد دُنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ شاید اب مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ

وہ اس خاکسار کے وطن چین کی زبان ہے۔ یہ زمانہ جمہوریت کا ہے اور جمہوریت کے فیصلوں کی بنیاد اکثریت پر ہوتی ہے۔ لہٰذا جس زبان کو اکثریت حاصل ہو گی وہی عالمی زبان ہو سکتی ہے اور یہ عزت سوائے چینی زبان کے کسی دوسری زبان کو حاصل نہیں۔ یہ کہہ کر جب وہ اپنی کرسی پر بیٹھے تو اردو کا نمائندہ اُٹھا اور اس نے کہا آپ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ چینی بولنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ لیکن میں نہایت ادب سے آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ چین سے باہر بھی یہ زبان کسی ملک یا شہر میں بولی سمجھی لکھی پڑھی جاتی ہے؟ چین سے باہر بھی کوئی غیر چینی اس زبان کا ادیب شاعر یا مصنف گزرا ہے؟ چین سے باہر بھی کسی ملک میں اس کے اخبار اور رسالے جاری ہیں؟ یہ کیسی اکثریت ہے؟ ایسی زبان کو کوئی بھی قبول کرے گا؟ ایسی زبان کو عالمی زبان کے لئے پیش کرنا سراسر کج فہمی اور نادانی ہے۔ اس پر سب نے خوب زور زور سے تالیاں بجائیں۔ چینی نمائندے سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا۔

بعینہٖ یہی حالت پاکستان میں بنگلہ زبان کی ہے۔ قائداعظم نے اپنی ڈھاکے والی تقریر میں بڑی سچی بات کہی تھی کہ آپ زبان کے متعلق اپنے صوبے کے لئے جو چاہیں فیصلہ کریں لیکن پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی۔ کیونکہ علاقائی زبان ہر حال میں علاقائی ہے وہ ساری مملکت کی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ لوگ بھی جانتے تھے جو بنگلہ تحریک کے بانی تھے۔ جہاں کہیں گئے یہ دھتکار دیئے گئے۔۔ "بڑے بڑے تعلیمی مراکز سلیم اللہ مسلم ہال، فضل الحق مسلم ہال وغیرہ میں بھی مجلس کے کارکنوں نے جلسے کرنے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ وہ ہر کمرے میں جا کر طلبہ سے ملے اور تحریک کی اہمیت پر زور دیا لیکن دو ایک کے سوا طلبہ نے کوئی توجہ نہ کی۔ صرف اُردو ہی قومی زبان ہونی چاہیئے۔ اور

اس وقت اس معاملے میں دماغ سوزی بیکار ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے"۔
(راشٹر ابھاشا اندولینز اتہاس)

"مجلس کے کارکن اکیلے تحریک کو آگے بڑھانے میں مصروف تھے اور کوئی تعاون کرنے والا نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ مختلف جماعتوں کے پاس گئے لیکن لیگ کانگرس، کمیونسٹ پارٹی، اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں سے ہر ایک سے مایوس ہونا پڑا۔ (ایضاً)

"سچ پوچھیئے تو سنگرام پریشد (مجلس جہاد) کی قیادت میں طلبہ اور کارکنوں کی اس قدر جانفشانی کے باوجود عوام ہمیشہ اس تحریک کی مخالفت کرتے رہے"
(ایضاً)

"طلبہ کے ایک بہت بڑے حصے نے بھی اُردو کی حمایت کرنے والی تحریک کا ساتھ دیا" (ایضاً)

اب یہ کارکن طلبہ دارالحکومت ڈھاکے سے باہر جاتے ہیں۔ وہاں کا حال سُنیئے :-

"راج شاہی میں طلبہ دو گروہ میں بٹ گئے۔ گروہ بندی کو حیلہ قرار دے کر کالج کے ارباب اختیار نے بنگلہ زبان کے حامیوں پر سخت ظلم کرنا شروع کیا۔ دونوں گروہ میں ہنگامہ ہُوا۔ بہت سے زخمی ہوئے اور بہت سے گرفتار ہوئے" (ایضاً)

"سنگرام پریشد نے چاٹگام میں جو نمایندے بھیجے تھے وہ وہاں کچھ بھی نہ کر سکے۔ بلکہ مجلس کے کئی کارکن "لال ڈگی" کے پاس اور میڈیکل اسکول میں پیٹے گئے۔ جلسے کرنا اور جلوس نکالنا وہاں کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ (ایضاً)

"سلہٹ کے گوبند پارک میں "تمدن مجلس" نے ایک جلسہ منعقد کیا۔

جلسہ ہو رہا تھا کہ مقامی لوگوں نے حملہ کر کے جلسے کے منتظمین کو بہت بُری طرح پیٹا اور مائیکروفون توڑ پھوڑ ڈالا۔" (ایضاً)

"دوسرے مقامات میں بھی تحریک تھوڑی بہت پھیل گئی۔ لیکن اس کو کہیں بھی عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔"

یہ بیانات بنگلہ تحریک کے بانی طلبہ اور پروفیسروں کے ہیں جو اُن کے شائع کردہ پمفلٹ سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے کئی بار میں لکھ چکا ہوں، تحریک زبان کا ہنگامہ ڈھاکا یونیورسٹی کے چند پروفیسروں (جن میں بھارتی ہندو پروفیسر شریک غالب تھے) اور کچھ طالب علموں کا اُٹھایا ہوا تھا۔ طالب علم ان پروفیسروں کے اشارے پر چلتے تھے۔ یہ تعلیم یافتہ اشخاص کی قلیل جماعت تھی جن کی تعلیم بنگلہ اور انگریزی کے ذریعہ ہوئی اور تربیت کے لئے بھی ماحول غیر اسلامی ملا۔ فارسی پہلے ہی خارج ہو چکی تھی۔ عربی کی تعلیم صرف دینی علوم تک تھی۔ اُردو ہی اب ایک ایسی زبان ہے جس کی بدولت ہماری تہذیب اور ہماری روایات زندہ ہیں۔ جہاں اس کے قدم نہیں پہنچے یا جہاں اس کا رواج کم ہے اسی نسبت سے وہاں ہماری تہذیب و تمدن اور ہماری روایات اور قومی عصبیت کا جذبہ بھی ہے۔ مشرقی بنگال خسارے میں اس لئے رہا کہ جب فارسی زبان دفتروں، عدالتوں اور مدارس سے خارج کر دی گئی تو شمالی ہند اور ہندوستانی ریاستوں اور دیگر مقامات میں فارسی کی جگہ اُردو نے لے لی۔ گویا دو زبانیں ہو گئیں۔ ایک انگریزی اور دوسری اُردو۔ بخلاف اس کے بنگال میں فارسی کی جانشین بنگلہ ہو گئی۔ اس لئے مسلمان تعلیم سے محروم ہو گئے اور اپنی تہذیب بھی کھو بیٹھے۔ بنگالی زبان میں تمام قصے کہانیاں، تاریخی روایات استعارات و تشبیہات سب ہندوانی ہیں اور زبان ہندو دیو مالا سے بھری ہوئی

ہے۔ تاہم مشرقی بنگال میں ایک زمانے میں اُردو کا خاصا چرچا رہا۔ ڈھاکا اور مرشد آباد اُردو کے بڑے مرکز تھے۔ یہاں اُردو کے بڑے اچھے شاعر ادیب اور مصنّف گزرے ہیں اور اب بھی ہیں۔ وہاں کے شرفا کی زبان اب بھی اُردو ہے۔ بنگالی نہیں جانتے اور جانتے بھی ہیں تو ٹوٹی پھوٹی۔ نواب صاحب ڈھاکا، مولوی فضل الحق، خواجہ ناظم الدین صاحب، سہروردی صاحب اور ان کا سارا خاندان مولانا محمد اکرم خان، خواجہ نورالدین یہ سب صاحب بہت اچھی اور فصیح اُردو بولتے ہیں اور بے تکلف تقریر کر سکتے ہیں۔ علما کی زبان اُردو ہے اور ان کے مدارس کا ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ ویسے عام طور پر بھی لوگ اُردو سے نابلد نہیں ہیں مثلاً شمالی اضلاع دیناج پور، راج شاہی میں لوگ اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں اور اہلِ علم پڑھتے اور لکھتے بھی ہیں۔ جنوب مغرب یعنی دریائے پدما کے مغرب میں کہیں بھی چلے جائیے مشکل سے ایسے آدمی نظر آئیں گے جو اُردو نہ سمجھتے ہوں۔ مشرق میں سلہٹ کے باشندے اُردو کے بہت بڑے حامی ہیں اور بے تکلف اُردو سمجھتے اور بولتے ہیں اور ان کے بعض مدارس میں اُردو کی تعلیم بھی ہوتی ہے یہی حال بعض دیگر مقامات کا ہے۔ بقول ڈاکٹر سُنتی کمار چیٹرجی کے مشرقی بنگال کے عوام اُردو کو "نبی جی کا بھاشا" کہتے ہیں۔ یہ حقیقت پر مبنی ہے کہ اُردو بولنے والے کو مقدس شخص سمجھ کر بڑی وقعت سے دیکھتے تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ عوام اُردو کے حامی ہیں۔ علما کی رائے میں پاکستان کی زبان صرف اُردو ہونی چاہیئے۔ جب کہ عربی مدارس کا جن کی تعداد سینکڑوں سے بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ گئی ہے، ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ جب کہ وہاں کے شرفا کی زبان اُردو ہے تو پھر اس ہنگامے کو کامیابی کیوں ہوئی؟

اس کی کامیابی نہ جلسے جلوسوں سے ہوئی اور نہ ہڑتال اور گولیاں کھانے

سے ۔اس کی کامیابی صرف صوبائی حکومت کی نا اہلی، کم زوری، غفلت اور بے تدبیری سے ہوئی۔ چنانچہ اس تحریک کے بانی اپنے پمفلٹ میں لکھتے ہیں:۔"عوام سارے کے سارے تحریک زبان کے خلاف تھے۔ طلبہ کے ایک حصے نے بھی اس کی مخالفت کی۔سرکاری ملازمین بھی اس تحریک میں آگے نہیں بڑھے تھے۔مفصلات کے بہت ہی کم مقامات میں تحریک کامیاب ہوئی تھی۔بہت سے مقامات میں بنگلہ کے خلاف تحریک ہو چکی تھی۔ باوجود اس کے ناظم الدین وزارت نے سنگرام پریشد کے سامنے کیوں اس طرح اپنی سپر ڈال دی"۔

اس کے وجوہ وہ یہ بتاتے ہیں:۔"اُس وقت کی حکومت طلبہ سے ڈرتی تھی"۔ دوسرے "قائداعظم نے اگر مشرقی پاکستان میں اس قسم کی بدنظمی دیکھی تو ناظم الدین وزارت کی بدنامی ہوگی"۔ تیسرے "ہمارے وزرا اور سکریٹریٹ کے ارباب اختیار اس وقت تک ضابطہ پرست حاکم (Bureauza) نہیں بنے تھے اور سخت قانون نافذ کرنے سے گھبراتے تھے۔ ان وجوہ سے خواجہ ناظم الدین اور ان کے وزرا گھبرا کر جلدی سے معاہدہ کرنے پر راضی ہو گئے"۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔"اگر عہدنامہ نہ ہوتا تو تحریک ناکام ہو جاتی۔ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے۔ تحریک کے پیچھے اس وقت رائے عامہ ہموار نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے لوگ غیر جانب دار اور مخالف تھے۔حکومت اگر سختی سے کام لیتی تو تحریک رک جاتی"۔ سختی سے بھی کام لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر حکومت باخبر ہوتی اور تدبر سے کام لیتی تو یہ تحریک بڑھنے نہ پاتی اور وہیں رک جاتی۔ حیرت کی بات ہے کہ حکومت کو یہ

نہ معلوم ہوا کہ عوام اس تحریک کے خلاف ہیں۔ سب طالب علم بھی متفق نہیں ہیں اور علما کبھی اس تحریک کا ساتھ نہ دیں گے۔ اس غفلت اور بے خبری کی کوئی انتہا ہے۔ اگر حکومت کے کسی شخص میں بھی تدبّر اور فراست ہوتی تو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض سرکاری اعلا عہدہ دار اور وزیر بھی اس تحریک میں ذاتی مفاد اور اغراض یا کسی اور نیت سے شریک ہو گئے۔ اور حکومت کو خبر نہ ہوئی یا خبر ہوئی تو کوئی انسداد نہ کر سکی۔ چنانچہ "راشٹر بھاشا اندولنیر اتہاس" میں لکھا ہے۔ "یادداشت پر جن لوگوں نے دستخط کئے ان میں بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ حتیٰ کہ محکمۂ پولیس کے آئی۔ جی، ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ نے بھی دستخط کر کے اس کی حمایت کی۔ اس وقت کئی صوبائی وزیر بھی خفیہ طور پر اس تحریک کی حمایت کرتے رہے۔" "سرکاری ملازمین اور کئی ایک وزیروں نے بھی چندہ دیا۔" بعض ایم۔ ایل۔ اے وزارت کی ہوس میں اس تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ خصوصاً محمد علی صاحب اور نصر اللہ صاحب پرجوش تقریریں کر کے طلبہ میں ہر دلعزیز ہو گئے" مگر حکومت آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔

اگر اس وقت خواجہ ناظم الدین کی جگہ مسٹر فضل الرحمن وزیر اعلا ہوتے تو یہ تحریک اُبھرنے نہ پاتی اور چند ہی روز میں اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ مسٹر فضل الرحمن کو کسی زبان سے محبت یا نفرت نہ تھی۔ اُن کو پاکستان سے محبت تھی اور جو چیز بھی پاکستان کی وحدت میں ممد ہوتی اس کی حمایت کرتے تھے۔ اُردو کی حمایت وہ اسی بنا پر کرتے رہے کہ اُس سے پاکستان کی وحدت کو استحکام حاصل ہوگا اور اسی بنا پر وہ بنگالی کو عربی حروف میں لکھنے کے حامی ہیں کہ اس سے مغرب و مشرق قریب تر ہو جائیں گے اور پاکستان کی وحدت و یک جہتی کو تقویت پہنچے گی۔ اور

اسی بنا پر وہ وحدانی حکومت کے قائل ہیں کہ اس سے تمام اختلافات اور تعصبات مٹ جائیں گے۔ بنگلہ تحریک کے بانی اور ان کے ہمدرد ان وجوہ سے مسٹر فضل الرحمٰن کے سخت دشمن ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے اپنے پمفلٹ میں کئی جگہ ان کے خلاف زہر اُگلا ہے۔

غرض کہ قائداعظم علیہ الرحمہ اور سابق وحال کے تمام اکابر ملت کی رائے کے خلاف ارکانِ حکومت نے نہایت بے دردی اور بے غیرتی سے ایک ایسے بُنیادی اور اہم مسئلہ کو جس پر قوم کا اتحاد اور پاکستان کی وحدت وسالمیت مبنی تھی خاک میں ملا دیا۔

ایسا کیوں ہوا ؟ اس لئے کہ حکومت پودنوں کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی تلاش ہے۔ اس کی آمد کا انتظار ہے !

ایسے فیصلے ہم پر کچھ اثر نہیں کر سکتے۔ ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ اور اپنی قومی زبان اُردو کی ترقی و فروغ و تکمیل میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے ؂

عبدالحق

# پاکستان میں اردو کا المیہ

## قائدِ اعظم کے اعلان سے قبل

پاکستان میں اردو کی داستان نے ایک المیہ کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں جب سے اُردو سرکاری زبان قرار پائی اُس وقت سے اغیار کی نظریں اُس پر بُرے طرح پڑنے لگیں۔ اس کی توڑ پر فورٹ کالج کلکتہ میں ایک فرمائشی اور مصنوعی زبان گھڑی گئی تھی۔ اُردو کے مقابلہ میں اس کے قدم جمنے مشکل تھے، اس لئے سرکار کی آڑ میں اُسے نیچا دکھانے کی کوشش کی گئی۔ یہ تنازعہ بڑھتا ہی گیا۔ سر سید احمد خاں جیسا شخص جس نے ایک سلطنت کا زوال اور دوسری کے عروج کو بڑھتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جسے اپنے ملک کے حالات کا تھوڑے ہی زمانے میں بہت کچھ تجربہ ہو چکا تھا، جو اپنی قوم کی حقیقت اور برادرانِ وطن کی رفتار و گفتار سے بخوبی واقف تھا اور اپنے ملک کو جو کچھ دن پہلے ایک بہت بڑی آفت جھیل چکا تھا، خوش حال دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ صدقِ دل سے یہ چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان آپس میں صلح و آشتی سے رہیں اور باہم مِل کر ایک دوسرے کی فلاح و بہبودی کا کام کریں۔ اُس نے تیس سال تک برابر اس بات کی کوشش کی۔ لیکن جب دوسری طرف سے اُردو کی مخالفت ہوئی جو اسلامی شہنشاہیت کی یادگار اور ہماری تہذیب کی

حائل ہے تو سرسید کو بہت صدمہ ہوا اور مجبوراً ہندوؤں سے رشتہ توڑنا پڑا۔
انھوں نے صاف کہہ دیا کہ اب ہم تم مل کر کام نہیں کر سکتے۔

بارہا اصحاب فکر نے اس بات پر غور کیا کہ ہندو مسلم جھگڑے کی اصل بنا کیا ہے۔ بہت کچھ بحث اور غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سارا جھگڑا ہندی اردو کا ہے۔ یہ جھگڑا کبھی کم کبھی شدت سے آخر تک جاری رہا۔ ہندو کو آپ کا مذہب، آپ کے رسم ورواج، آپ کی بدمزاجی سب کچھ گوارا تھی، مگر اردو گوارا نہ تھی۔ ابھی تقسیم ملک کی سن گن ہی تھی کہ بھارت کے حاکموں نے اردو کو مٹانے کی ٹھان لی تھی۔ وہ علانیہ کہتے تھے کہ پاکستان اسی نے بنایا ہے، اسے ہم اپنے ملک میں نہیں رہنے دیں گے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر اردو رہی تو قومی غیرت وحمیت کے وہی جذبات پیدا کرے گی جو پاکستان بنانے کے ذمہ دار ہیں۔

مسلمانوں نے پاکستان کے لئے جو حیرت انگیز قربانیاں کیں اس کا ایک اہم مقصد اپنی تہذیب وزبان کو اغیار کی دست برد سے بچانا بھی تھا۔ تقسیم ملک کے وقت دوست دشمن سب یہ امر طے شدہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کی قومی زبان اردو ہوگی اور یہ ہمارے وطن موعود کے مختلف علاقوں اور عناصر میں اتحاد ویک جہتی کی شان پیدا کرے گی۔

اس حقیقت کو ارکان حکومت میں سے اول اول اگر کوئی سمجھا تو وہ مسٹر فضل الرحمن تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے :-

پاکستان کے قیام کو ابھی کچھ اوپر تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ اس باہمت وزیر تعلیم نے بڑے پیمانے پر ایک ایجوکیشنل کانفرنس کا ڈول ڈالا۔ جس کے اجلاس دارالحکومت کراچی میں ۲۷ نومبر ۱۹۴۷ء سے پہلی دسمبر ۱۹۴۷ء تک ہوتے رہے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے صوبوں اور ریاستوں کے وزرا و نظما اور

ماہرانِ تعلیم مدعو کئے گئے تھے۔ یہ پہلی تعلیمی کانفرنس تھی جس میں تمام اہم بنیادی مسائل پر غور کیا گیا۔ اس میں زبان کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا۔ یہاں میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس کانفرنس میں اُردو کو کس قدر اہمیت دی گئی اور اس کے متعلق کن خیالات کا اظہار کیا گیا۔

صدر کانفرنس جناب فضل الرحمٰن نے اپنے فاضلانہ خطبہ میں اُردو زبان کی تائید میں اپنا خیال نہایت مدلّل اور پُرزور الفاظ میں اس طرح ادا فرمایا:۔

"ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کی ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش رکھنی چاہیئے، نہ صرف ذریعۂ تعلیم کے لئے بلکہ اس تہذیب کی اشاعت کے لئے بھی جو ان زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ ہماری مشترک تہذیب (کلچر) کی وحدت کو کوئی آسیب نہ پہنچے۔ اس وحدت کے تیقّن کے لئے ہمیں ایک بین صوبائی زبان کی ضرورت ہے۔ اس بارے میں اُردو زبان کے حقوق ہماری خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ یہ مسلمانانِ ہند کی خاص تخلیق ہے اور اس نے مقابلتہً اپنی زندگی کی کم مدّت میں ادائے مافی الضمیر، خیال کے نازک سے نازک فروق اور تخیل کی بلند ترین پرواز کے اظہار کی غیر معمولی قوت اور نزاکتِ احساس حاصل کرلی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ مستعار لینے اور اپنے میں جذب کر لینے کی صلاحیت، فارسی، عربی اور انگریزی سے اس کے تاریخی تعلقات اور نظم ونثر میں اس کا اعلا تخلیقی سرمایہ، یہ سب میری نظر میں اُسے پاکستان کی "لنگوا فرینکا" کا مرتبہ دینے کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل ہیں۔"

اس کے بعد ارکان کانفرنس مختلف کمیٹیوں میں ہر درجۂ تعلیم کے مسائل پر غور کرنے کے لئے بٹ گئے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ذریعۂ تعلیم کے متعلق یہ طے کیا۔ "کمیٹی اس امر کو محسوس کرتی ہے کہ پاکستان کی نئی قوم کو قائم رکھنے کے لئے ایک مشترک (کامن) زبان کا ہونا لازم ہے۔ کمیٹی نے اس پر اتفاق کیا کہ مشترک زبان (کامن لینگوایج) اُردو ہونی چاہیئے۔ بعض ارکان نے کہا کہ یہ پاکستان کی مشترک زبان ہی نہیں بلکہ ہر صوبے میں ذریعۂ تعلیم بھی ہونی چاہیئے۔ کچھ ارکان نے اس خیال کی تائید کی کہ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ ہر صوبے کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق اس کا فیصلہ کرے لیکن اُردو تمام اسکولوں میں لازمی دوسری زبان ہونی چاہیئے۔ ارکان کمیٹی اس رائے کی تائید میں تھے۔

اس کانفرنس کی مجلس تعلیم بالغان میں یہ طے پایا کہ "کمیٹی کی رائے میں تعلیم بالغان کا ذریعۂ تعلیم صوبائی زبانیں ہونا چاہئیں۔ لیکن کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ صوبائی وحدتوں میں باہم اتحاد پیدا کرنے کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ دَورانِ تعلیم کسی نوبت پر اُردو کی نوشت و خواند شروع کردی جائے۔"

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو ابتدائی، ثانوی اور یونیورسٹی کی جملہ کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس ہُوا جس کے صدر میاں افضل حسین تھے۔ اس میں جملہ کمیٹیوں نے سفارش کی کہ تمام اسکولوں میں اُردو بطور لازمی زبان کے پڑھائی جائے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ صوبائی حکومتیں اسکول ہی کے دورانِ تعلیم میں ذریعہ یا ذرائع تعلیم کا فیصلہ کریں گی مگر پاکستان کے نظام تعلیم میں ترقی رفتار کے ساتھ بتدریج اُردو کو بطور ذریعۂ تعلیم اختیار کیا جائے۔"

کانفرنس کی مشترکہ کمیٹی کی سفارشوں پر جو قراردادیں منظور ہوئیں اُن میں ایک قرارداد یہ تھی :-

" کانفرنس کے مندوبین کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اُردو پاکستان کی لنگوا فرینکا تسلیم کی جائے اور اس امر کے تیقن کے لئے ملک کے تعلیمی اداروں میں اس کے پڑھانے اور سیکھنے کے لئے کافی سہولتیں پیدا کی جائیں۔ یہ بھی واضح کیا گیا کہ اُردو کو پاکستان کی قومی زبان تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اُردو کو بطور لازمی زبان کے مروج کیا جائے "

" یہ کانفرنس مجلس دستور ساز سے سفارش کرتی ہے کہ اُردو پاکستان کی لنگوا فرینکا تسلیم کی جائے "

" قرار پایا کہ اُردو اسکولوں میں بطور لازمی زبان کے پڑھائی جائے۔ یہ امر کہ پرائمری اسکولوں میں کس نوبت پر اس کی تعلیم شروع کی جائے صوبائی اور ریاستی حکومتوں پر چھوڑ دیا جائے۔ صوبائی اور ریاستی حکومتیں تعلیم اسکول ہی کے دوران میں ذریعہ یا ذرائع تعلیم کا فیصلہ کرلیں گی "

مذکورہ بالا سفارشیں مشترکہ کمیٹی کی جانب سے پیش ہوئی تھیں۔ کانفرنس کے آخری اور کامل اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

" یہ کانفرنس مجلس دستور ساز ( کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی ) سے سفارش کرتی ہے کہ اُردو پاکستان کی عام مشترک زبان (لنگوا فرینکا) تسلیم کی جائے "

" یہ قرار پایا کہ اُردو اسکولوں میں بطور لازمی زبان کے پڑھائی جائے۔ یہ امر کہ ابتدائی مدارس میں کس نوبت پر اسے جاری کیا جائے صوبائی اور ریاستی حکومتوں کی رائے پر چھوڑ دیا جائے متعلقہ صوبائی

اور ریاستی حکومتیں اسکول ہی کے دوران تعلیم میں ذریعہ یا ذرائع تعلیم کا فیصلہ کریں گی "

پاکستان کے ارکانِ حکومت میں مسٹر فضل الرحمٰن پہلے شخص ہیں جنھوں نے صاف اور پُر زور الفاظ میں اُردو کے حقوق کو تسلیم کیا اور اُسے پاکستان کی لنگوا فرینکا کا مرتبہ دینے کا اعلان کیا۔ یہ کانفرنس جو اُنھوں نے پاکستان کے قیام کے فوراً بعد منعقد کی تھی بڑی دُور اندیشی اور تدبر پر مبنی تھی۔ اس میں مختلف علاقوں کے مختلف خیال و مسلک اور مختلف اشغال و فکر کے اصحاب شریک تھے لیکن مسٹر فضل الرحمٰن کی شخصیت ان سب پر چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے کام کی تقسیم، کمیٹیوں کی ترتیب اور جملہ کمیٹیوں میں ربط قائم کرنے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ اور خاص کر کانفرنس کا آخری اجلاس جو بہت اہم اور دشوار تھا، انھوں نے بڑے سلیقے اور تحمل کے ساتھ بغیر بیجا طوالت یا نا روا عجلت کے اس خوبی سے اتمام کو پہنچایا کہ تمام شرکائے کانفرنس ان کی تنظیمی قابلیت اور تدبر کے قائل ہو گئے۔ اگرچہ کانفرنس میں مختلف اصول و عقائد اور مختلف زبانوں کے زبان دان اور اپنی اپنی زبانوں کے شیدائی شریک تھے لیکن وہ زبان کے مسئلہ میں مسٹر فضل الرحمٰن کے خیالات اور دلائل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ہر شعبۂ تعلیم کی کمیٹی میں اُردو کو لازمی زبان اور ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا اور کانفرنس کے آخری اجلاس میں جو تمام مندوبین اور جملہ کمیٹیوں کا مجموعی اجلاس تھا اُردو کو پاکستان کی لنگوا فرینکا تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی۔

مسٹر فضل الرحمٰن نے بحیثیت وزیر تعلیم بساط بھر اُردو زبان کی اعانت و ترقی میں کوشش کی۔ انجمن ترقیٔ اُردو پاکستان کی بلا طلب اپنی تحریک پر سالانہ امداد منظور کرائی۔ اُردو کمیٹی قائم کی، اُردو اکیڈمی کی تجویز پیش کی، انجمن ترقیٔ اُردو کالج

کی تائید میں حتی الامکان کوشش کی۔ مسٹر فضل الرحمٰن نے جو ہر موقع پر اردو کی حمایت کی وہ محض اس بنا پر تھی کہ اس سے پاکستان کی وحدت و سالمیت کو تقویت پہنچے گی۔ ان وزراء اور ارکان حکومت اور ارکان اسمبلی کو جو اردو کے زبان داں ہونے کے مدعی اور اس کی بہی خواہی کا دم بھرتے ہیں شرمانا چاہیئے۔ یہ حضرات اردو کی حمایت کرتے نہ کرتے لیکن کم سے کم اس سے غداری تو نہ کرتے۔

اب میں آپ کو مشرقی پاکستان لے جانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ لسانی تحریک نے وہاں کیا گل کھلایا اور صوبائی حکومت کی نااہلی نے اس اہم اور بنیادی مسئلہ کا کس طرح خون کیا ہے۔ یہ حالات میں ایک بنگالی کتابچے "راشٹر بھاشا اندولنیر اتہاس" (یعنی تحریک زبان کی تاریخ) سے بے کم و کاست نقل کرتا ہوں۔ یہ کتابچہ "تمدن مجلس" کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ زبان کا یہ ہنگامہ اسی مجلس کا اُٹھایا ہوا تھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ اس کے مصنف ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ابوالقاسم ہیں جو اس تحریک کے بانی مبانی تھے۔ یہ کتابچہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوا۔ اب اس بارے میں یہاں جو کچھ لکھا جائے گا، وہ انھیں کی تحریر ہوگی جن کی بدولت یہ شورش برپا ہوئی۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا تاکہ جانب داری کا گمان نہ ہو۔

"سب کو معلوم ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان کی قومی زبان کیا ہوگی۔ اس مسئلہ پر غور کرنے والے بہت کم لوگ تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس وقت کثرت سے لوگ اُردو ہی کے حامی تھے۔ لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے دو ہفتے بعد یعنی یکم ستمبر ۱۹۴۷ء کو "تمدن مجلس" نام کی ایک مختصر جماعت ڈھاکہ یونیورسٹی کے کچھ طلبہ اور پروفیسروں نے قائم کی اور ڈھاکے میں مختلف مقامات پر چند ادبی جلسوں کا انتظام کیا۔ اس کے بعد ۱۵ ستمبر کو ایک کتابچہ

موسومہ "پاکستان کی قومی زبان بنگلہ ہے یا اُردو" اس مجلس کی طرف سے شائع ہُوا۔ اس کتابچے کے لکھنے والے تین صاحب تھے۔ ۱۔ پروفیسر قاضی مطہر حسین ۲۔ ابوالمنصور احمد ایڈیٹر اتحاد۔ ۳۔ پروفیسر ابوالقاسم۔ اس میں مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بنگلہ زبان پاکستان کی دوسری قومی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کتابچے کے شروع میں تمدن مجلس کی مندرجہ ذیل چند قراردادیں ہیں۔

۱۔ (ا) مشرقی پاکستان کا ذریعۂ تعلیم

(ب) مشرقی پاکستان کی عدالتی زبان

(ج) اور مشرقی پاکستان کی دفتری زبان بنگلہ ہوگی۔

۲۔ پاکستان کی مرکزی حکومت کی دو زبانیں ہوں گی۔ بنگلہ اور اُردو۔

۳۔ (ا) مشرقی پاکستان میں تعلیم کی پہلی زبان بنگلہ ہی ہوگی۔ مشرقی پاکستان کے سو فیصدی لوگ اس زبان کو حاصل کریں گے۔

(ب) مشرقی پاکستان میں اُردو ثانوی یا بین صوبائی زبان ہوگی۔ جو لوگ پاکستان کے دوسرے حصّوں میں ملازمت وغیرہ کے سلسلہ میں متعین کئے جائیں گے صرف وہی لوگ اس زبان کی تعلیم حاصل کریں گے۔ مشرقی پاکستان میں پانچ سے دس فیصدی لوگوں نے بھی یہ زبان سیکھ لی تو کافی ہے۔ ثانوی اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں میں اس کی تعلیم ثانوی زبان کی حیثیت سے دی جا سکتی ہے۔

(ج) انگریزی پاکستان کی تیسری زبان یا بین الاقوامی زبان ہوگی۔ پاکستان کے ملازم کی حیثیت سے جو لوگ دُنیا کے دوسرے ممالک میں متعین ہوں گے یا جو لوگ اعلیٰ سائنس کی تعلیم حاصل کریں گے،

صرف وہی لوگ انگریزی پڑھیں گے۔ ان کی تعداد مشرقی پاکستان میں کبھی فی ہزار ایک سے زیادہ نہ ہوگی۔

اس اصول کے مطابق مغربی پاکستان کے صوبوں میں (بشرطیکہ مقامی زبانوں کا مسئلہ نہ اٹھایا گیا ہو) اردو پہلی زبان، بنگلہ ثانوی زبان اور انگریزی تیسری زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔

۴۔ حکومت کے کام چلانے اور سائنس کی تعلیم کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے فی الحال چند سال کے لئے انگریزی اور بنگلہ دونوں زبانوں میں حکومت مشرقی پاکستان کے کام انجام پاتے رہیں گے۔ اسی دوران میں حسب ضرورت بنگلہ زبان کی اصلاح کرنی ہوگی۔

اس امر کے پیش نظر کہ اہل ملک کی ذہنی قوت ضائع نہ ہو، ملک کے لوگ جس زبان میں آسانی کے ساتھ کم سے کم وقت میں پڑھنے لکھنے اور بات چیت کرنے پر قادر ہوں وہی زبان قومی زبان ہوگی۔ یہی دلیل مندرجہ بالا قراردادوں کی بنیاد ہے۔" (پاکستان کی قومی زبان بنگلہ ہے یا اردو۔ ص ۱۳-۱۴)

"آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شروع شروع میں اس کتابچے کو پانچ خریدار بھی نصیب نہ ہوئے۔ مجلس کے جو چند ارکان تھے انھوں نے اس کتابچہ کو لے کر مختلف مقامات کا گشت لگایا، ذاتی طور پر بھی بہت سے لوگوں سے گفتگو کی۔ لیکن دو ایک کے سوا کسی نے منہ نہ لگایا اور ہر جگہ سے مایوس ہو کر لوٹنا پڑا۔ ہر شخص اس بات کے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ ابھی ابھی تو اتنی مصیبتوں کے بعد پاکستان حاصل ہوا ہے۔ ایسے وقت میں ایک سے زیادہ زبانوں کا مسئلہ اٹھانا بہت مضر ہے اور خصوصاً دو زبانوں کا قومی زبان قرار پانا نہایت بے بنیاد بات ہے۔

بڑے بڑے تعلیمی مرکزوں مثلاً سلیم اللہ ہال، فضل الحق مسلم ہال وغیرہ میں بھی مجلس کے کارکنوں نے جلسے کرنے کی کوششیں کیں مگر ناکام رہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہر کمرے میں جاکر طلبہ سے ملے اور تحریک کی اہمیت پر زور دیا۔ لیکن دو ایک کے سوا کسی نے توجہ نہ کی اور بار بار یہی کہتے رہے کہ قومی زبان صرف اُردو ہونی چاہیئے۔ اس معاملے میں اس وقت دماغ سوزی کرنا بیکار ہے۔

اِدھر سے مایوس ہوکر مجلس کے کارکنوں نے چند سرکاری ملازموں اور چند ادیبوں سے اس معاملے میں سلسلہ جنبانی کی۔ اس میں کسی قدر کامیابی ہوئی۔ اس وقت ایک یادداشت تیار کی گئی اور اُس پر صوبے کے مشہور لوگوں کے دستخط لئے گئے۔ مجلس کے کارکنوں کو صوبے بھر کا دورہ کرنے کے بعد بڑی مشکل سے یہ دستخط حاصل ہوئے۔ یہ یادداشت حکومت کے سامنے پیش کی گئی اور اسکی نقل چند اخباروں میں شائع کی گئی۔ اس وقت کے مقامی اخباروں میں سے کسی اخبار نے بھی اسے کوئی اہمیت نہ دی۔ البتہ اس معاملے میں کلکتہ کے اخبار "اتحاد" نے بڑی مدد دی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس یادداشت پر جن لوگوں نے دستخط کئے تھے اُن میں بیشتر سرکاری ملازم تھے۔ حتیٰ کہ محکمۂ پولیس کے انسپکٹر جنرل ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ نے بھی دستخط کرکے اس کی حمایت کی۔ کئی صوبائی وزیر بھی خفیہ طور پر اس تحریک کی حمایت کرتے رہے[1]۔

طلبہ میں اس تحریک کو مقبول بنانے کی غرض سے مجلس نے (آخر) اکتوبر یا نومبر میں فضل الحق ہال میں حبیب اللہ بہار کی زیرِ صدارت ایک جلسے کا انتظام کیا۔ مقررین میں کوی جسیم الدّین، قاضی مطہر حسین، کوی

---

[1] یہ شاید اس لئے ممکن ہوا کہ بعض سرکاری افسروں کا رویہ بنگلہ زبان کے متعلق مخالفانہ تھا۔

غلام مصطفٰی[۱] اور چند صوبائی وزیر[۲] تھے۔

## تحریک اور مسٹر فضل الرحمٰن

مجلس کی اس قدر جد و جہد کے باوجود کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اتفاق سے اس وقت کے مرکز کے وزیر فضل الرحمٰن صاحب نے کراچی کے زیرِ اثر اُردو کی وکالت میں چند ایسی قابلِ اعتراض باتیں کہہ دیں جن سے بنگلہ بولنے والوں کے دل کو تکلیف پہنچی[۳]۔ علاوہ اس کے مختلف طریقوں سے اُردو کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان اور ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوششیں ہونے لگیں[۴]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ مجلس کی تحریک کو اپنی تحریک

---

[۱] کوہی غلام مصطفٰی نے اس جلسے میں اپنی تقریر میں اُردو کے حق میں بہت زور دیا اور کہا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہونی چاہیئے۔ (ملاحظہ ہو ہندوستان اسٹینڈرڈ۔ مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۴۷ء)

[۲] زبان کے مسئلہ میں خود وزیروں میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک گروہ ان لوگوں کا تھا جو کسی حال میں بھی بنگلہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے سرخیل خواجہ ناظم الدین اور حمید الحق چودھری تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو بنگلہ کا حامی تھا۔ اس کے سرگردہ حبیب اللہ بہار، افضل صاحب وغیرہ تھے۔ ابتک یہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پہلی بار اس جلسے میں انھوں نے کھلم کھلا بنگلہ کی حمایت کی۔ ان کی تقریریں اس وقت مختلف اخباروں میں چھپی تھیں مگر جب تحریک رفتہ رفتہ زور پکڑتی گئی تو انھوں نے آگے بڑھنے سے گریز کیا۔

[۳] میں نے مسٹر فضل الرحمٰن کی تقریریں بہت غور سے پڑھیں۔ اس میں انھوں نے بنگلہ کے خلاف مطلق کوئی بات نہیں کی۔ البتہ اُردو کی حمایت میں انھوں نے بہت پُرزور الفاظ کہے اور کہا اُردو ہی پاکستان کی لنگوا فرینکا ہو سکتی ہے۔ یہ بات بنگالیوں کو ناگوار گزری ہو تو اور بات ہے۔ (ع)

[۴] یہ صحیح نہیں۔ مشرقی پاکستان میں کبھی اُردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اسے بطور ثانوی زبان پڑھانے کی تجویز کی گئی تھی۔ (ع)

سمجھنے لگے۔ اسی وقت سے یونی ورسٹی کے قریب مجلس کے دفتر میں لوگوں کا آنا جانا شروع ہوا۔ اور اسی دفتر میں کارکنان مجلس کی ایک نشست میں "سنگرام پریشد" (جہاد کمیٹی) قائم کی گئی اور مجلس کے ایک کارکن جو یونی ورسٹی میں پروفیسر بھی تھے "سنگرام پریشد" کے داعی (کنوینر) مقرر ہوئے۔

## سنگرام پریشد کی کارروائی

سنگرام پریشد نے تحریک کا ذمہ لے کر سب سے پہلے فضل الرحمن صاحب سے مولا صاحب کے مکان واقع نظیرا بازار پر ملاقات کی۔ اُن سے کارکنان سنگرام کی گرما گرم بحث ہوئی۔ فضل الرحمن صاحب نے ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اس کے بعد سنگرام پریشد کے کارکن طلبہ کی طرف سے ایک یادداشت پیش کرنے کے کام میں لگ گئے۔ چند ہفتوں کی کوشش سے کئی ہزار دستخط فراہم کر لئے۔ وہ یادداشت حکومت کے سامنے پیش کی گئی مختلف اخباروں میں شائع بھی ہوئی۔

## حمایت حاصل کرنے کی کوشش

اب تک مجلس کے کارکن ہی تنہا اس تحریک کے آگے بڑھانے کے کام میں مصروف تھے اور کوئی تعاون کرنے والا نہ تھا۔ اس لئے وہ اس تحریک کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے مختلف جماعتوں کے پاس گئے۔ مسلم لیگ، کانگریس، کمیونسٹ پارٹی، اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں سے کسی نے بھی منہ نہ لگایا اور مایوس ہو کر آنا پڑا۔ مسلم لیگ اسے خاطر ہی میں نہ لائی۔ کانگریس کے کارکن اس کا نام سُن کر چونک پڑے۔ ایک روز کمیونسٹ پارٹی (واقع عقب جج کورٹ) کے دفتر میں ایک میٹنگ تھی۔ کامریڈ مظفر احمد اس نشست کی صدارت کر رہے تھے۔ سنگرام پریشد کے نمائندے اُن سے جا کر

ملے۔ انھوں نے کہا اس تحریک کی حمایت کرنی اُن کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے یادداشت پر دستخط کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے بھی ساتھ دینے سے گریز کیا۔

## سنگرام پریشد کی توسیع

اس وقت اسٹوڈنٹس لیگ میں تفرقہ پیدا ہو گیا۔ طلبہ دو گروہوں میں بٹ گئے۔ شاہ عزیز الرحمٰن کی قیادت سے منحرف ہو کر شیخ مجیب الرحمٰن، عزیز احمد قاضی غلام محبوب وغیرہ کی قیادت میں "مشرقی پاکستان مسلم اسٹوڈنٹس لیگ" کے نام سے ایک جماعت قائم ہوئی جس کے داعی مسٹر نعیم الدین مقرر ہوئے۔ طلبہ کے ایک گروہ نے اس اسٹوڈنٹس لیگ کی قیادت قبول کر لی اور سنگرام پریشد میں آکر مل گیا۔

## یونیورسٹی گراؤنڈ میں پہلی میٹنگ اور قرارداد یوم احتجاج

ان دنوں مسٹر فضل الرحمٰن اور دیگر چند ارکان کے خلاف (جو اردو کے حامی تھے) طرح طرح کی خبریں مشہور کرنی شروع کیں اور اس قسم کی افواہیں پھیلائیں کہ منی آرڈر فارموں اور نوٹوں میں بنگلہ زبان نہیں رکھی جائے گی۔ ان حالات میں سنگرام پریشد نے جنوری ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتے میں یونیورسٹی کے سامنے ایک جلسہ منعقد کیا اور جلسے میں یہ قرارداد پاس ہوئی کہ فروری میں ایک یوم احتجاج منایا جائے۔

اس کام میں سنگرام پریشد کو مالی دشواری پیش آئی۔ ارکان نے دو دو چار چار آنے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ سرکاری ملازمین نیز کئی وزیروں نے بھی چندہ دیا۔ حمید الحق چودھری صاحب اور بعض دوسرے وزرا کے ہاں بھی پہنچے مگر وہاں ان کی دال نہ گلی۔ اس رقم سے جو جمع ہوئی تھی پوسٹر اور اشتہار

چھپوائے گئے اور طلبہ کو مختلف اضلاع میں کیٹیاں بنانے کیلئے بھیجا گیا۔

## تحریک کی مخالفت

تحریک کچھ کچھ زور پکڑ رہی تھی لیکن اسی کے ساتھ اس کی مخالفت بھی ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ بڑی بڑی انقلابی باتیں کر کے سنگرام پریشد میں شریک ہو گئے۔ طلبہ اور کارکنوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ بعض ایم۔ایل۔اے اس تحریک کے حامی بن کر وزارت کے خواب دیکھنے لگے اور زبان کی تحریک کو وزارت کی کش مکش میں تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ وہی حضرات جو پہلے زبان کی تحریک لایعنی تصور کرتے تھے اب اس کی حمایت میں پر زور تقریریں کرنے لگے۔ اس ترکیب سے محمد علی صاحب اور نصراللہ صاحب اور بعض دیگر ایم۔ایل۔اے طلبہ میں بہت ہر دلعزیز ہو گئے۔ بہت سے ایم۔ایل۔اے ڈینگیں مار کر لیڈر بن گئے اور تحریک سے فائدہ اٹھا کر سفارت یا وزارت کے عہدے حاصل کر لئے۔ جن میں جناب محمد علی صاحب و تفضل علی صاحب قابلِ ذکر ہیں۔

## زبان کی تحریک اور عوام

اس دوران میں سنگرام پریشد میں مختلف جماعتوں اور مختلف کالجوں اور اسکولوں کے نمائندوں کو شریک کر کے اس کی اور توسیع کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ سنگرام پریشد کی قیادت میں طلبہ اور کارکنوں کی انتہائی کوشش کے باوجود عوام ہمیشہ اس تحریک کی مخالفت کرتے رہے۔ ایسے وقت میں چند انتہا پسندوں نے خفیہ طور پر کچھ پوسٹر شائع کئے۔ اس سے حکومت کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ یہ دشمنانِ حکومت کا کام ہے۔ عوام بھی سخت برافروختہ ہوئے اور مقامی لوگوں نے تمدن مجلس کے دفتر پر حملہ کر دیا۔ اہل ڈھاکہ نے اس تحریک کے خلاف سخت غم و غصہ کا اظہار کیا۔ مجلس کے کارکنوں اور طلبہ کے لئے شہر میں

داخل ہونا غیر ممکن ہو گیا۔ مجلس کے کارکن سلیم اللہ مسلم ہال کے جنرل سکریٹری جو بھیس بدل کر بلیادی پریس میں دستی اشتہار (ہینڈ بل) چھپوانے گئے تھے کسائی ٹولی میں پکڑے گئے۔ ڈھاکا یونی ورسٹی کے پروفیسر ابوالقاسم صاحب اور ڈھاکا کالج کے پروفیسر احسن صاحب پر کئی بار حملے ہوئے اور پٹے۔ اب طلبہ اور کارکنان مجلس ایک طرح رمنا کے علاقے میں محصور ہو گئے۔

## اُردو کی حمایت

مجلس کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر اُردو کی حمایت میں ایک تحریک کا آغاز ہوا۔ مولانا دین محمد وغیرہ کی قیادت میں شہر کے مختلف محلوں اور ڈھاکے کے باہر مختلف مقامات میں اُردو کی حمایت میں جلسے ہوئے اور کئی لاکھ کے دستخط فراہم کر کے مرکزی حکومت کے سامنے ایک یادداشت پیش کی گئی۔ ڈھاکے کے "مورننگ نیوز" اور سلہٹ کے اخبار "جوگ بھیری" نے اُردو کی حمایت میں بہت پُرزور مضامین لکھے اور سنگرام پریشد کی تحریک کی سخت مخالفت کی۔

## بنگلہ تحریک کے خلاف طلبہ کی ایک جماعت

طلبہ کی ایک بہت بڑی جماعت نے بھی اس وقت اُردو تحریک کا ساتھ دیا اور اس کے ارکان نے رائے بازار سے طلبہ کا ایک جلوس نکالا اور ڈھاکا کالج میں لے کر آئے۔ اسی وقت فضل الحق ہال سے بھی مسٹر شمس الہدیٰ کی قیادت میں ایک جلوس نکالا گیا۔

## جلوس اور ہڑتال

سنگرام پریشد نے ہڑتال کی تیاری کی اور ریلوے کے مزدوروں کو اس میں شریک ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ مقررہ تاریخ کو یونی ورسٹی کے سامنے جلسہ ہوا۔ جلسے کے بعد جلوس نکلا۔ یہ جلوس ہائی کورٹ تک نہایت امن اور خوش انتظامی کے ساتھ

آیا۔ لیکن اس دوران میں بعض نہایت ناشائستہ حرکات عمل میں آئیں [1] یعنی ایک وزیر کے باغ کو پامال کر دیا۔ بعض وزیروں کی داڑھیاں پکڑ کر کھینچی گئیں اور بے عزتی کی گئی اور کئی گھنٹے تک سکرٹیریٹ کا محاصرہ کر کے ان کو بند رکھا اور ڈرا دھمکا کر ایک ایسی تحریر لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر وہ بنگلہ کو قومی زبان بنانے میں ناکام رہے تو وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے اور پیشگی استعفا بھی لکھوا لیا۔

ایک یہ خبر یکبارگی شہر میں پھیل گئی کہ شہر کے چند گنڈے سکرٹیریٹ آپہنچے ہیں۔ اور اُن کے حملے کے خوف سے طلبہ سکرٹیریٹ چھوڑ کر بھاگ نکلے اس وقت سنگرام پریشد کے چند کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

دوسرے روز پھر جلوس نکلا۔ پولیس نے اُسے سکرٹیریٹ کے قریب روکا۔ طلبہ اور پولیس میں تصادم ہوا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا اور بہت سوں کو گرفتار کر لیا۔ بعض کو جیل خانے میں لے جا کر داخل کر دیا اور کچھ کو بس میں لاد کر تیج گاؤں اور نرائن گنج لے جا کر چھوڑ دیا۔

سکرٹیریٹ میں بھی ہڑتال کرانے کی کوشش کی گئی لیکن کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔ یوں ہی برائے نام تھوڑی سی سرسراہٹ ہو کے رہ گئی۔ دوسرے دن ہڑتال کی وجہ سے صبح کو ڈھاکا جانے والی دو تین ریل گاڑیاں بند رہیں۔ بعد میں سب گاڑیاں بدستور چلنے لگیں۔ شہر میں دوکانیں بند کرنے کا اہتمام کیا گیا مگر کچھ پیش نہ گئی اور سخت ناکامی ہوئی۔

**مضافات** تمدن مجلس نے اپنے کارکن اضلاع میں بھی بھیجنے شروع کئے۔ نواکھالی اور جیسور میں ہڑتال اور جلوس میں خاصی

---

[1] پریشد والوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ حرکت ان لوگوں کی تھی جو "وزارت کے لالچیوں" کے حامی تھے۔ ممکن ہے یہ بھی ہو لیکن طلبہ اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔

کامیابی ہوئی۔ راج شاہی میں طلبہ میں مخالف موافق دو گروہ ہو گئے۔ کالج کے ارباب اختیار نے جلوسیوں اور ہڑتالیوں کی خوب خبر لی۔ ان میں سے کچھ گرفتار بھی ہو گئے۔ طلبہ کے دو گروہ میں مار پیٹ اور ہنگامہ ہوا اور بہت سے زخمی ہو گئے

پریسیڈنسی نے چاٹ گام کو جو نمائندے بھیجے تھے انھیں بہت ناکامی ہوئی اور کچھ نہ کر سکے بلکہ اس کے کئی کارکن "لال دیگھی" اور میڈیکل اسکول میں پٹ گئے۔ وہاں جلسے کرنا اور جلوس نکالنا کسی صورت سے ممکن نہ ہوا۔

سلہٹ کے گوبند پارک میں تمدن مجلس نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں مقامی لوگوں نے حملہ کر کے جلسے کے منتظمین کو بُری طرح پیٹا اور مائکروفون توڑ پھوڑ ڈالا۔

دوسرے مقام میں بھی یہ تحریک تھوڑی بہت پہنچی۔ لیکن اسے کہیں عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ یہ صرف طلبہ تک محدود رہی۔ یہاں تک کہ ڈھاکے میں بھی دکانیں بند نہ کرا سکے۔

**گفت و شنید** اس اثنا میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ قائدِ اعظم ڈھاکے تشریف لا رہے ہیں۔ ایسا بھی سننے میں آیا کہ انھوں نے خواجہ ناظم الدین صاحب کو ہنگامہ فرو کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ قائدِ اعظم کی آمد آمد سے ارکان حکومت میں سراسیمگی پھیلی۔ قائدِ اعظم کا بے حد رعب تھا۔ خواجہ صاحب کو یہ اندیشہ دامنگیر ہوا کہ اگر قائدِ اعظم کی تشریف آوری کے وقت طلبا کوئی ہنگامہ کر بیٹھے تو اُن کی اور اُن کی حکومت کی بڑی بدنامی ہو گی۔

اب سمجھوتے، نا ہنجار سمجھوتے کا وقت آتا ہے۔ سمجھوتا ہمیشہ ڈرپوک کرتا ہے یا کم زور۔ مشرقی بنگال کی حکومت میں یہ دونوں وصف موجود تھے اور مزید براں کچھ اور خوبیاں بھی تھیں۔ مثلاً بے تدبیری، صحیح اور اندرونی حال سے

ناواقفیت، بے رغبی، حکومت کے افسروں اور بعض وزیروں کی خفیہ اور بعض اوقات علانیہ ریشہ دوانیاں۔ اگر خواجہ صاحب یا ان کے کسی وزیر میں دور بینی یا فراست ہوتی تو وہ واقعات ظہور میں نہ آتے جو بعد میں واقع ہوئے۔ ہوا یہ کہ خواجہ صاحب نے وقتی مصلحت کو تو پیش نظر رکھا مگر انجام کو نہ سوچا اور سنگرام پریشد کو منانے کے لئے بعض امور اس کے سامنے پیش کئے۔ پریشد والے ان کی کم زوری کو سمجھ گئے اور پیش کردہ امور کو مسترد کر دیا۔ لیکن جب پریشد والوں سے یہ کہا گیا کہ تمہارے سب مطالبات تسلیم کرلئے جائیں گے تو وہ راضی ہو گئے۔ خواجہ صاحب کی ارکان سنگرام پریشد کے ساتھ دو نشستیں ہوئیں۔ سنگرام پریشد نے جناب خواجہ صاحب کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط پیش کیں۔

۱۔ فوری طور پر بنگلہ کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان، عدالتی زبان اور ذریعۂ تعلیم قرار دیا جائے۔

۲۔ صوبائی اسمبلی میں ایک قرارداد پاس کرا کے مرکزی حکومت کو بھیجی جائے جس میں یہ سفارش کی جائے کہ مرکزی حکومت بنگلہ زبان کو دوسری قومی زبان تسلیم کرلے۔

۳۔ تحریک زبان کے سلسلہ میں جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں اُن کو بلا کسی شرط کے رہا کر دیا جائے۔

۴۔ دوران تحریک "اتحاد" "امرت بازار" "آنند بازار" "جگانتر" وغیرہ اخباروں پر جو پابندی لگائی گئی تھی وہ اُٹھالی جائے۔

۵۔ سرکاری ملازمین جو زبان کی تحریک سے وابستہ تھے ان میں سے کسی کو کسی قسم کی بھی سزا نہ دی جائے۔

۶۔ پریس نوٹ شائع کر کے یہ اعلان کیا جائے کہ زبان کی تحریک کسی طرح

دشمنانِ حکومت کی ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔

۷۔ زبان کی تحریک کو دبانے کے لئے حکومت نے جو طریقہ اختیار کیا اس کے لئے علانیہ ناظم الدین صاحب کو معافی مانگنی پڑے گی۔

کافی بحث مباحثہ کے بعد ناظم الدین صاحب نے ۲، ۴، ۵، اور ۷ کو چھوڑ کر باقی مطالبات کو تسلیم کر لیا۔ مطالبہ نمبر ۲ کے متعلق یہ کہا کہ اس کا تعلق مرکزی حکومت سے ہے۔ صوبائی حکومت اس میں کچھ نہیں کر سکتی۔ مطالبہ نمبر ۴ کے متعلق یہ فرمایا کہ چند اخباروں پر پابندی اس لئے عائد کی گئی ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف لکھتے رہے ہیں۔ مطالبہ نمبر ۵ کے متعلق ان کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری کاموں میں تنظیم برقرار رکھنا ضروری ہے ورنہ حکومت کا نظم و نسق قائم رکھنا ناممکن ہو جائے۔ مطالبہ نمبر ۷ کے متعلق یہ کہا کہ کھلم کھلا اظہار افسوس کرنے سے اُن کی عزت پر حرف آتا ہے۔ البتہ وہ سنگرام پریشد کے سامنے اظہار افسوس کر سکتے ہیں۔

سنگرام پریشد نے اعلان کیا کہ جب تک تمام مطالبات نہ مان لئے جائینگے یہ تحریک بند نہیں کی جائے گی۔

کئی روز بعد ناظم الدین صاحب نے سنگرام پریشد کے نمائندوں سے پھر ملاقات کی۔ بہت دیر تک بحث ہوتی رہی لیکن سنگرام پریشد کے نمائندے اپنے آٹھوں مطالبات پر قائم رہے۔ آخر خواجہ ناظم الدین صاحب کو سنگرام پریشد کے تمام مطالبات ماننے پڑے۔ ساتھ ہی ان آٹھ شرائط کی بنیاد پر ایک عہد نامہ مرتب ہُوا۔ ایک طرف سنگرام پریشد نے اور دوسری طرف حکومت کی جانب سے ناظم الدین صاحب نے دستخط کئے۔

یہ بات کسی کے سان و گمان میں بھی نہ تھی کہ خواجہ ناظم الدین صاحب اس طرح سنگرام پریشد کے مطالبات تسلیم کر لیں گے۔ کیونکہ اس وقت کی تحریک نے

۱۹۵۲ء کی طرح ہمہ گیر صورت اختیار نہیں کی تھی۔ عوام سب کے سب تحریک زبان کے خلاف تھے۔ طلبہ کی ایک بڑی جماعت اس کی مخالف تھی۔ سرکاری ملازمین نے بھی اس تحریک میں قدم آگے نہیں بڑھایا۔ مفصلات کے بہت کم مقامات میں تحریک کو کامیابی ہوئی۔ بہت سے مقامات میں بنگلہ کے خلاف تحریک چل چکی تھی۔ اس کے باوجود ناظم الدین وزارت نے سنگرام پریشد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ حکومت طلبہ سے ڈرتی تھی اور ان کا لحاظ بھی کرتی تھی۔ کیونکہ بعض وزیر یا ایم۔ ایل۔ اے انھیں کی مدد سے اس رُتبے پر پہنچے تھے۔ دوسرے اگر قائداعظم نے مشرقی پاکستان میں آکر ناظم الدین وزارت کو بدنظمی دور کرنے میں ناکام پایا تو اس سے وزیروں کی نااہلی ثابت ہوگی۔ اس لئے جلدی جلدی عہد کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ تیسرے ہمارے وزرا اور ارباب سکریٹریٹ میں ابھی شان دفتری حکومت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے سخت قانون نافذ کرنے میں پس وپیش کرتے تھے۔ (اکثر لوگ کہتے تھے کہ ناظم الدین صاحب اگرچہ اُردو کے دل سے حامی ہیں۔ پرذاتی طور پر بدنظمی سے گھبراتے ہیں۔ اس لئے جلدی جلدی عہد کرنے پر راضی ہوگئے)

## عہد نہ ہوتا تو کیا ہوتا

اگر عہد نہ ہوتا تو تحریک بالکل ناکام ہوجاتی اس سے پہلے ہی لکھا جاچکا ہے کہ تحریک کے پیچھے اس وقت رائے عامہ ہموار نہیں ہوئی تھی۔ اکثر لوگ غیر جانب دار یا مخالف تھے۔ حکومت اگر سختی سے کام لیتی تو تحریک ختم ہوجاتی۔ دوسری طرف احسن منزل میں ڈھاکے کے باشندوں سے یہ طے ہو رہا تھا کہ اگر قائداعظم کے آنے کے بعد بھی طلبہ نے یہ تحریک چلائی تو وہ یونی ورسٹی کے ہالوں پر حملہ کرکے تحریک چلانے والوں کو ٹھیک کردیں گے۔ کیونکہ اس میں قائداعظم

توہین ہے۔ ارباب حکومت اس قسم کا پروپیگنڈا کر کے تحریک کا بالکل خاتمہ کر سکتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مستقبل میں اس قسم کی کوئی تحریک آسانی سے نہ پنپ سکتی۔

## معاہدے کے بعد

تحریک کے دوران میں کئی سو شخص گرفتار ہوئے تھے۔ معاہدے کے بعد اُن سب کو رہا کر دیا گیا۔ بھارت کے جن اخباروں پر پابندی عائد کی گئی تھی اُن پر سے پابندی اُٹھالی گئی۔ گورنمنٹ کی طرف سے تحریک چلانے والوں کے ساتھ جو بُرا سلوک کیا گیا اُس پر ناظم الدین صاحب نے اپنے بیان میں اظہار افسوس کیا۔ اور اپنے بیان میں یہ بھی کہا کہ زبان کی تحریک دشمنان پاکستان کی سازش سے عمل میں نہیں آئی۔ نیز یہ کہا کہ سرکاری مُلازمین کو سزا دینے کی جو تجویز تھی وہ بھی ترک کر دی گئی۔ اور سب سے بڑھ کر اُنھوں نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ (بجٹ) اجلاس میں بنگلہ کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان، عدالتی زبان اور ذریعہ تعلیم قرار دینے کی قرارداد پاس کرائی جائے گی اور اسے مرکز کی دوسری قومی زبان بنانے کی سفارش کی جائے گی۔

عہد نامے کی شرائط مختلف اخباروں میں نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کی گئیں۔ اکثر اخباروں نے سنگرام پریشد کو اس کی کارگزاری پر تحسین و آفرین کی۔

## قائداعظم کا اعلان

مشرقی پاکستان میں لسانی تحریک کی یہ کیفیت تھی جو ہم نے اوپر بانیان تحریک ہی کے الفاظ میں بیان کی ہے۔ تمدن مجلس نے اپنے پمفلٹ میں بھارتی ہندو پروفیسروں کا نام نہیں آنے دیا حالانکہ یہ راز اب آشکار ہو چکا ہے کہ طلبہ کے بہکانے اور بھڑکانے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ دوسرے انھوں نے مغربی بنگال

کے ہندو حامیوں کو بڑی ہوشیاری سے بچانے کی کوشش کی ہے مگر دل کی بات چھپا نہ سکے۔ معاہدے یا صلح نامے کی دو شرطیں اس کی غمازی کر رہی ہیں ایک بھارت کے ان اخباروں پر سے پابندی اُٹھا لینے پر اصرار جنھوں نے اس تحریک کی حمایت کی تھی اور شر انگیز مضامین لکھ کر طلبہ کو مشتعل کیا تھا۔ دوسرے اس بات پر اصرار کہ خواجہ صاحب اپنے بیان میں خاص طور پر اس کا اعلان کریں کہ یہ دشمنانِ پاکستان کی تحریک نہ تھی۔ اسی طرح انھوں نے کمیونسٹوں کی کارروائیوں پر بھی پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس معاملے میں انھوں نے طلبہ کو اُکسانے اور اُبھارنے میں کیا کچھ نہیں کیا۔

جیسا کہ میں ابتدا میں لکھ چکا ہوں یہ مانی ہوئی بات تھی کہ اسلامی مملکت پاکستان کی عام اور مشترک زبان (لنگوا فرینکا) اُردو ہی ہوگی۔ چنانچہ جو ایجوکیشنل کانفرنس پاکستان کے قیام کے فوراً بعد وزیر تعلیم مسٹر فضل الرحمٰن کی صدارت میں منعقد ہوئی (جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے) اُس نے متفقہ طور پر یہ سفارش کی کہ اُردو کو پاکستان کی "لنگوا فرینکا" تسلیم کیا جائے۔

یہ بات سب کے علم میں ہے کہ بھارت کی حکومت اور اس کے مقتدر ارکان اور نیتاؤں نے انتہائی کوشش کی کہ پاکستان بننے نہ پائے اور بن جائے تو چلنے نہ پائے۔ اس کے لئے انھوں نے کیا کیا سازشیں، کارستانیاں، اور فن فریب کئے یہ ایک طویل داستان ہے۔ یہ ہماری آنکھوں دیکھی بات ہے کہ پاکستان ابھی بننے بھی نہ پایا تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے با اثر ارکان اور ان کے ہمخیال اصحاب نے اس تمام علاقے میں جو پاکستان کے زیر اثر آنے والا تھا طرح طرح کی دہشتناک افواہیں پھیلانی شروع کیں۔ جس کی بنا پر عام لوگ بہت ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان بنتے ہی مسلم لیگ

ان کی دھن دولت لوٹ لے گی اور ان کو اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کر دے گی
مجھے یہ حقیقت ۶/ جنوری ۱۹۴۸ء کو اس وقت معلوم ہوئی جب جہاز سے اتر کر
کچھ سکھ بلا اطلاع پولیس یا ارکان حکومت یکبار گی شہر کراچی میں گھس آئے۔ ان کے
زخم خوردہ یہاں پہلے ہی سے موجود تھے سکھوں کو جو دیکھا تو ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس میں
کچھ ہندو بھی لپیٹ میں آ گئے۔ میں ان میں سے بعض ہندوؤں سے ملا اور ان سے باتیں
کیں۔ وہ بات کرتے ہوئے تھر تھر کانپتے تھے۔ ان کے چہرے زرد، لب خشک
اور آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ ان کی حالت بہت قابل رحم تھی۔ اس وقت انھوں نے وہ
تمام حقیقت حال بیان کی جو نیشنل کانگریس والوں کی خوفناک افواہوں سے ملک میں
پیدا ہو گئی تھی۔

یہ عجیب بات تھی کہ وہ تمام علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جو پاکستان
کے حصے میں آنے والے تھے، کانگریسی ہندوؤں کے زیر اثر تھے اور ان علاقوں کی
جان ان ہندوؤں کی مٹھی میں تھی۔ سندھ، صوبہ سرحد، بنگال میں خالص کانگریسی
حکومت تھی۔ رہا پنجاب وہ یونینسٹ حکومت کے ہاتھ میں تھا جو مسلمانوں کے حق
میں کانگریسی حکومت سے بدتر نہیں تو بہتر بھی نہ تھی۔ اس لئے کانگریسیوں اور مہا سبھائیوں
کی سب سے کارگر اور مہلک تدبیر یہ تھی کہ انھوں نے ان علاقوں کے ان تمام اشخاص
کو جن کے ہاتھ میں دولت، تجارت، حرفت و صنعت اور تعلیم، غرض وہ تمام شعبے
تھے جن پر انسان کی خوش حالی اور بہبودی کا مدار ہے، یہ ہدایت کی کہ وہ ان علاقوں
کو فوراً چھوڑ کر بھارت چلے آئیں اور اپنے دلائل کے زور اور پاکستانی علاقوں کی
مالی و اقتصادی ناداری کے اعداد و شمار، خاکے اور نقشے دکھا کر یہ یقین دلایا کہ
تمہارے چلے آنے سے وہاں نہ کوئی ملک کے نظم و نسق کا سمجھنے والا رہے گا اور نہ
بڑے تاجر اور مہاجن اور بنکوں کے مالک رہیں گے۔ نہ کالجوں میں کوئی فاضل پروفیسر

نظر آئے گا، نہ اعلا درجے کے ڈاکٹر اور انجنیر ہوں گے۔ پاکستان ناکام ہو جائیگا
ملک میں ابتری پیدا ہو جائے گی۔ لوگ بھوکے مرنے لگیں گے۔ تجارت بند ہو جائیگی
حرفت وصنعت کا نام و نشان نہ رہے گا۔ کالج اور مدرسے بند پڑے رہیں گے۔
لوگوں میں بے چینی، مایوسی اور بغاوت کے آثار نمودار ہوں گے۔ آخر مجبور ہو کر
پاکستان ہماری خوشامد کرے گا اور ہماری شرائط پر بھارت میں ضم ہونے میں اپنی
نجات تصوّر کرے گا۔ تم پھر فاتحانہ شان سے اپنے گھروں کو واپس جاؤ گے اور جو
کچھ تم اس وقت کھوؤ گے اس سے کہیں زیادہ پاؤ گے اور پہلے سے کہیں بڑھ کر
تمھاری قوت، حکومت اور دولت ہوگی۔ یہ خیالات کئی سال تک رہے۔ اب بھی
وہاں کی حکومت اور اُن کے سربراہ اپنی معاندانہ کارروائیوں سے باز نہیں آئے۔

مغربی بنگال اصل بنگال تھا۔ بنگال کی سیاست، وہاں کی دولت، تجارت
صنعت و حرفت، علم و کمال سب مغربی بنگال والوں کے دستِ قدرت میں تھا۔
مشرقی بنگال تو ان کی چراگاہ تھا۔ پاکستان بننے کا سب سے بڑا صدمہ ہندو بنگال
کو تھا۔ یہ وہی صدمہ ہے جو لارڈ کرزن کے عہد میں تقسیم بنگال سے ہوا تھا جس کے
خلاف زبردست ہنگامے اور غضب ناک شورشیں ہوئی تھیں۔ اُنہیں یہ کسی طرح
گوارا نہ تھا کہ اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ وہاں کے ہندو سرمایہ دار
اور سیاست کار اپنے ہم خیال اشخاص اور ہم مذہب بھائیوں کے ذریعہ کوئی نہ
کوئی ایسا شوشہ چھوڑتے رہتے ہیں جس سے مقامی مسلمانوں میں اور خاص کر
مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان بدگمانی اور نفاق پیدا ہو۔ اُن کا اصل منشاء
یہ ہے کہ مشرقی پاکستان اس قدر بددل اور بیزار ہو جائے اور اس کے دل میں مغربی
پاکستان کی نفرت اور عداوت اس قدر جاگزیں ہو جائے کہ وہ بالآخر اپنا تعلق مغربی
پاکستان سے بالکل منقطع کر لے۔ وہ اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ جب یہ نوبت

پہنچ جائے گی تو پھر اسے مغربی پاکستان میں ملا لینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔

ان ہنگاموں کی خبریں جب کراچی پہنچیں تو لوگوں میں بہت اضطراب پیدا ہوا یہ گویا پاکستان کی وحدت پر پہلا حملہ تھا۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر یہ فتنہ فوراً نہ دبا دیا گیا تو پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ میں جناب سردار عبدالرب نشتر کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں کہ وہ ان کا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"اس وقت حضرت قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ بقید حیات تھے۔ انھوں نے محسوس فرمایا کہ یہ تحریک ملک کی وحدت اور بُنیادی تخیل پر ایک کاری ضرب ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے کر ڈھاکہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستان نیا نیا عالمِ وجود میں آیا تھا اور حکومت بے سروسامانی کی حالت میں قائم ہوئی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ایسا طیارہ موجود نہ تھا جو ایک ہی اُڑان میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان پہنچ جائے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ ہمارے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا قائدِ اعظم مرحوم ہی کا ناقابلِ شکست اور محکم عزم ہمارا سرمایہ تھا جسے ہم کسی خطرے میں ڈالنا نہ چاہتے تھے۔ مگر قائدِ اعظم نے ایک پُرانی مشین میں مزید پٹرول کا انتظام کیا اور ڈھاکے کے سفر کا خطرہ مول لیا۔ ہماری خواہشات اور درخواستوں کی پروا نہ کرکے انھوں نے اپنی زندگی کو ملکی وحدت واستحکام کی بازی پر لگا دیا۔ ایک پُرانے ڈکوٹا جہاز میں ڈھاکے پہنچے اور اُن سرپھرے طلبہ کو جنھوں نے دشمنانِ پاکستان کے کہنے میں آکر اس قسم کا سوال اُٹھایا تھا سمجھایا کہ اگر تم پاکستان کو

قائم اور برقرار رکھنا چاہتے ہو تو یاد رکھو کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو سکتی ہے، کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ اسی سے آپ حضرات اندازہ لگائیے کہ زبان کے سوال کو قائدِ اعظم کس قدر اہمیت دیتے تھے۔ اِس زمانے میں یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے سیاست داں ہر معاملے میں قائدِ اعظم کی سند اپنے اعمال و افعال کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ اپنی تائید میں ان کے بیانات اور سابقہ تحریروں کے حوالے دیتے ہیں۔ مگر یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جن کی رہنمائی میں ملک حاصل ہوا، جن کی برکت سے ابتدائی سال سکون و امن سے گزر گیا (حالانکہ ہر لمحہ اس نوزائیدہ مملکت کے لئے نئے نئے خطرات کا پیغام لے کر آتا تھا۔) انھوں نے اس معاملے میں مختتم اور فیصلہ کُن بات کہہ دی۔ قائدِ اعظم کی اپنی زبان اُردو نہیں تھی مگر اُنھوں نے ڈنکے کی چوٹ اور بار بار کہا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہو گی۔ اس سے کسی ایسے پاکستانی کو جو ملک سے عقیدت اور محبّت رکھتا ہو اور قائدِ اعظم کو اپنا باوقار رہنما مانتا ہو، ہرگز اُن کے قول کی مخالفت زیبا نہیں۔ میرا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ جو چیزیں پاکستان کے قیام اور اس کی عمارت کی سنگِ بُنیاد تصوّر کی جاتی ہیں اُن میں سے ایک اُردو ہے۔ اس کو ہلانا اور مٹانا پاکستان کو ہلانا اور مٹانا ہے۔"

قائدِ اعظم ۹/ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے دو تقریریں کیں ایک عام جلسے میں ریس کورس کے میدان میں جہاں بقول راشٹر بھاشا اندولن کئی لاکھ کا مجمع تھا۔ اور ایک یونیورسٹی کے کانووکیشن میں۔ ان دونوں تقریروں میں انھوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں

اردو کے متعلق اپنا فیصلہ [illegible] اب تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے :-

"میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دشمن ہے۔"

اس کے ساتھ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ صوبے اپنی زبان کچھ قرار دیں لیکن پاکستان کی زبان صرف اُردو ہوگی۔

قائداعظم کے اس قطعی اور ناطق فیصلے کے بعد زبان کی شورش دب گئی اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب اُردو پاکستان کی قومی زبان ہو کے رہے گی۔ اور وہ اُردو کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ بعض ہندوؤں نے بھی اُردو پڑھنی شروع کردی۔

اس کے بعد بقول "راشٹر بھاشا اندولنیر اتہاس" اسمبلی کے اجلاس میں خواجہ ناظم الدین صاحب نے حسب وعدہ حکومت کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی جس میں بنگلہ کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان، عدالتی زبان اور ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی گئی۔ کانگریس کے ارکان کے ساتھ دوسرے ارکان نے بھی اتفاق کیا اور قرارداد پاس ہوگئی۔ لیکن بنگلہ کو دوسری قومی زبان بنانے کے متعلق خواجہ صاحب نے کچھ نہ کہا۔

سنگرام پریشد نے جب اس بارے میں اُن سے استفسار کیا تو کہا کہ قائدِ اعظم جو بابائے ملت ہیں ارشاد فرما گئے ہیں کہ اُردو ہی قومی زبان ہوگی۔ اس لئے اگر یہ قرارداد پاس کراتے تو قائداعظم کی توہین ہوتی۔

"اب سنگرام پریشد نے بنگلہ کو مرکز کی سرکاری زبان تسلیم کرانے کے متعلق دوبارہ تحریک کرنے کا اعلان کیا اور اس مقصد کے پیش نظر عوام سے تعلقات بڑھانے کے لیے مختلف کارروائیاں کی گئیں۔ مگر کوئی اس تحریک کا ساتھ دینے کے لیے راضی نہ ہوا۔" یہ تھا قائد اعظم کی شخصیت کا اثر۔ چنانچہ سنہ ۴۸ء سے سنہ ۵۲ء تک اس بارے میں کسی قسم کی کوئی تحریک نہ ہو سکی۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے مملکت پاکستان کا بار سنبھالا۔ وہ ۹/ اکتوبر سنہ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکے تشریف لے گئے۔ وہاں یونی ورسٹی کے طلبہ نے ان کی خدمت میں ایک ایڈریس (سپاسنامہ) پیش کیا جسے ایک ہندو طالب علم نے جو یونین کا سکریٹری تھا پڑھا۔ اس میں کئی شکایتیں تھیں۔ مثلاً مرکزی حکومت مغربی پاکستان کے ساتھ رعایت کرتی اور مشرقی پاکستان کو مستقل طور سے نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ اس پر نواب زادہ مرحوم بہت برہم ہوئے اور انھوں نے نہایت سخت اور درشت لہجے میں فرمایا کہ ان باتوں سے صوبائی تعصب کی بساندآتی ہے اور میں اسے ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر سب خاموش ہو گئے اور کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

سنہ ۱۹۴۹ء میں مرحوم نے سندھ یونیورسٹی کے سالانہ اجلاس میں اپنا خطبہ تقسیم اسناد (کانوو کیشن ایڈریس) اردو میں پڑھا۔ اور اردو زبان کے متعلق بعض ایسے خیالات کا اظہار فرمایا جس سے میں مطمئن نہ تھا۔ اور میں نے اس بارے میں ان کو خط لکھا۔ انھوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ملاقات کے وقت فرمایا کہ میں نے اپنا خطبہ اردو میں پڑھا اور اس میں اردو کی تعریف و تائید کی۔ میں سمجھا تھا کہ آپ خوش ہوں گے۔ مگر تعجب ہے آپ ناراض ہو گئے اور فوراً اٹھ کر گئے اور اپنا خطبہ لے کر آئے اور اس میں سے بعض مقامات پڑھ کر سنائے

میں نے کہا اُردو کے متعلق جو کچھ آپ نے فرمایا ہے وہ سب منفی صورت میں ہے کوئی مثبت بات نہیں فرمائی۔ اس پر وہ کچھ لاجواب سے ہو گئے اور فرمایا پھر کیا کیا جائے۔ میں نے کہا ہم آپ کو انجمن کی طرف سے مدعو کریں گے اور سپاس نامہ پیش کریں گے۔ اس کے جواب میں آپ اپنے خیالات کا اظہار فرما سکتے ہیں چنانچہ اس پر انھوں نے رضامندی ظاہر فرمائی۔ ان کے مشورے سے جلسے کی تاریخ ۱۹/ نومبر ۱۹۴۹ء مقرر ہوئی۔ انجمن کی دعوت پر تشریف لائے۔ اس کے کالج اور اس کے کتاب خانے کا معائنہ فرمایا۔ اس کے بعد جلسے میں تشریف لے گئے، سپاس نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کے جواب میں انجمن کے بھرے جلسے میں اردو کے متعلق یہ فرمایا:۔

"مجھے یہ کہنے میں باک نہیں اور میں چاہتا ہوں کہ صاف الفاظ میں یہ واضح کر دوں کہ اُردو اور صرف اُردو ہماری قومی زبان ہے۔ اور یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔"

بُنیادی اصول کی کمیٹی کی انٹرم رپورٹ ۱۹۵۰ء کی دفعہ ۱۲۰ میں صاف الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ "مملکت کی قومی زبان اُردو ہوگی"۔ اور دفعہ ۱۲۱ میں اصول تسمیہ ( Normenclature ) کے متعلق تحریر ہے کہ "اصطلاحی الفاظ قومی زبان کے ہونے چاہئیں۔ دستور کے انگریزی نسخے میں یہ الفاظ انگریزی ترجمہ کے ساتھ درج کیے جائیں"۔

نواب زادہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ان کے جانشین جناب خواجہ ناظم الدین صاحب ہوئے۔ اُس وقت بھی اُردو بنگالی کا کوئی مسئلہ نہ تھا سب یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ پاکستان کی زبان بالآخر اُردو ہوگی۔ چنانچہ جناب

خواجہ صاحب نے انجمن ترقی اُردو پاکستان کی کُل پاکستان اُردو کانفرنس منعقدہ مئی ۱۹۵۱ء کے افتتاحی خطبے میں فرمایا :-

" صرف یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کے مختلف حصّوں میں مشترک ہے بلکہ پاکستان کے باہر بھی اس سے کام چلایا جا سکتا ہے ۔ بھارت کا تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ، برما ، ملایا ، عدن اور جنوبی مشرقی اور مغربی افریقہ تک میں یہ بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ ہند پاک برِعظیم کی کسی اور زبان کے بولنے اور سمجھنے والے دُنیا میں اتنے نہیں جتنے کہ اُردو کے ہیں ۔

. . . . . . . . . . قائدِ اعظم علیہ الرحمہ کی مادری زبان اُردو نہ تھی ۔ وہ آخر وقت تک بھی اس میں اچھی طرح تقریر نہیں کر سکتے تھے ۔ انھیں سب سے زیادہ مہارت انگریزی زبان میں حاصل تھی مگر ان کی دُور بین نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوال ذاتی یا صوبائی نہیں بلکہ قومی اور ملّی ہے ۔ اگر پاکستان کے مختلف زبانیں بولنے والوں کو آپس میں شیر و شکر بنانا ہے اور اگر پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو اس کی ایک قومی زبان بھی ہونی ضروری ہے ۔ اور یہ سوائے اُردو کے کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی ۔ لہٰذا انھوں نے کھلے لفظوں میں اس بات کا اعلان فرمایا ۔ ان کا ارشاد ہمارے لئے حرفِ آخر کا حکم رکھتا ہے ۔ "

. . . . سنہ ۱۹۵۲ء کو جناب خواجہ صاحب مسلم لیگ کے اجلاس کے سلسلے میں ڈھاکا تشریف لے گئے تو آپ نے ۲۷/ جنوری کو ایک عام جلسے میں زبان کا ذکر کرتے ہوئے قائدِ اعظم کے اُس مشہور یادگار قول کو دُہرایا جسے اب تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ۔ یہ کہنا تھا کہ دوسرے ہی روز یونی ورسٹی کے فتنہ پرداز بھارتی ہندو

پروفیسروں نے جن کی کثرت تھی اور جو لڑکوں کو متحدہ بنگال کے خواب دکھاتے رہے تھے، طلبہ کو بھڑکایا۔ اُس وقت کے وائس چانسلر ایک معمولی لیاقت اور عامیانہ سیرت کے شخص تھے جو نہ معلوم اس منصب عالی پر کیوں کر پہنچ گئے تھے انھوں نے یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اغماض سے کام لیا۔ اُن کی پُر معنی خاموشی سے پروفیسروں اور طالب علموں کو شہ مل گئی۔ اب ایک (All Parties Committee of action for state language) یعنی کل جماعتی مجلس عمل برائے زبان سرکاری بنائی گئی۔ اور اُس کے زیر اہتمام ایک میل لمبا احتجاجی جلوس نکالا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ وزیر اعظم اپنا یہ بیان واپس لیں کہ "پاکستان کی سرکاری زبان صرف اُردو ہوگی" اُس دن یونی ورسٹی میں ہڑتال ہوئی اور جلسہ بھی کیا گیا جس میں بنگالی کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی تحریک کے خلاف بھی سخت بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ اور اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی مملکت کی زبان تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک بات اس جلسے میں یہ بھی کہی گئی کہ خواجہ صاحب جب مشرقی بنگال کے وزیر اعلا تھے تو انھوں نے طلبہ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے کوشش کریں گے ۲۷/ جنوری کی تقریر سے مبینہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس بنا پر طلبہ نے خواجہ صاحب کو یاد دلایا کہ وہ اُس معاہدے کی رُو سے پہلے ہی پابند ہو چکے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خلاف یہ الزام صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایسا وعدہ نہیں کیا تھا۔ البتہ یہ ضرور کہا تھا کہ وہ بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تائید کریں گے۔ جگن ناتھ کالج کی یونین نے بھی بنگالی کے حق میں تجویز پاس کی۔ علاوہ اس کے ۳۱/ جنوری کو ڈھاکا لائبریری ہال میں مسلم لیگ کے سوا باقی سب جماعتوں کا ایک مشترکہ جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت صوبائی عوامی لیگ کے صدر مولانا عبد الحمید خان بھاشانی نے کی۔ مسلم لیگ اور حکومت کے

مخالفوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر عوام کے جذبات بھڑکانے کے لئے بیان بازیوں اور تقریروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چنانچہ عوامی لیگ کے سکریٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری، نوجوان لیگ کے جنرل سکریٹری اور اخبار پاکستان آبزرور نے خواجہ صاحب کے خلاف خوب زہر اگلا۔ اور تو اور کمیونسٹ پارٹی کی تنظیمی کمیٹی نے بھی اپنی مقبولیت کے لئے اس موقع کو غنیمت جان کر اردو کے خلاف ایک بیان جاری فرمایا۔

جب اخبارات کے نمائندوں نے خواجہ صاحب سے دریافت کیا کہ زبان کے مسئلے میں آپ کی ذاتی رائے کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ "مجھے قائد اعظم پر کلی اعتماد ہے اور میں ان کی پوری تقلید کرتا ہوں۔ یہ مسئلہ مجلس دستور ساز میں پیش ہوگا۔" ڈھاکے سے روانگی کے وقت ہوائی اڈے پر فرمایا کہ گزشتہ ماہ ۲۷ جنوری کو میں نے قائد اعظم کی اس تقریر کا حوالہ دیا تھا جو انھوں نے مارچ ۱۹۴۸ء میں کی تھی۔ بعض حلقوں میں میری تقریر کو توڑ موڑ کر پیش کیا گیا ہے اور ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ میں نے قائد اعظم کی نہیں بلکہ خود اپنی رائے پیش کی ہے۔"

یہ عجیب و غریب بیان ہے۔ قائد اعظم کا قول نقل کرنے کا کیا مقصد تھا۔ اگر خواجہ صاحب اس سے متفق نہ تھے تو اس کے پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اگر اس سے متفق تھے تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ قائد اعظم کی رائے تھی میری اپنی رائے نہ تھی۔ خواجہ صاحب بہت نیک دل، شریف النفس اور بامروت شخص ہیں۔ یہ سب خوبیاں ہیں، اخلاقی جرات نہیں۔ اسی کمزوری کا ارتکاب مولوی سلیمان ندوی مرحوم سے بھی ہوا کہ طالب علموں نے ان کی کار کو گھیر لیا اور ڈرایا دھمکایا تو انھوں نے ڈھونس میں آکر اس کاغذ پر جھٹ سے دستخط کر دیئے جو وہ لکھ کر لائے تھے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ ہشتار یکل کانفرنس میں انھوں نے

جو کچھ کہا تھا وہ سب غلط تھا باطل تھا۔ حالانکہ ان کے خطبے میں کوئی بات بنگالی زبان کے خلاف نہ تھی۔ وہ ایک تاریخی معاملہ تھا۔ اگر مولانا اپنے کہے کو حق سمجھتے تھے تو ہرگز اس سے انحراف نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ خواہ کچھ ہی ہوتا۔ اخلاقی جرأت دکھاتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ خواجہ صاحب نے پہلی غلطی تو یہ کی کہ اس مسئلہ کو خواہ مخواہ چھیڑا۔ اس کا انہیں خود بھی اعتراف ہے۔ اس سے بڑھ کر دوسری غلطی یہ کی کہ اپنے قول کی غلط تاویل کی اور گھبرا کر ایسے فقرے کی آڑ لی جس نے ان کی بات کو سبک کر دیا۔ تیسری غلطی یہ کی کہ قائدِ اعظم کے قول کے ساتھ یہ فرمایا کہ اس مسئلہ کا فیصلہ مجلس دستور ساز کرے گی۔ قائدِ اعظم یا قائدِ ملت نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ اس مسئلہ کا فیصلہ مجلس دستور ساز کرے گی۔ قائدِ اعظم نے جب یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اردو ہوگی تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا تھا کہ "اس معاملے میں جو کوئی غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے وہ پاکستان کا دشمن ہے" اس کے بعد اس مسئلہ پر مزید غور کرنے، مشورے یا منظوری کے لئے کسی کانفرنس یا اسمبلی میں پیش کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ مگر وہی حضرات جو ہر معاملے میں قائدِ اعظم کے قول پیش کرتے ہیں اور قائدِ اعظم کے پیرو ہونے پر فخر فرماتے ہیں کسی معمولی مصلحت کی خاطر ایسے بنیادی اور مسلمہ اصول سے جس پر قائدِ اعظم کی مہرِ تصدیق ثبت تھی، انحراف کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔

"۲۷/ جنوری کے بعد سے۔ جس دن ڈھاکے میں وزیرِ اعظم کی تقریر پر نعرے لگائے گئے۔ ۲۱/ فروری تک کا عرصہ حکومت مشرقی بنگال اور مرکز کے سوچنے اور سنبھلنے کے لئے کافی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دوران میں مشرقی بنگال کے مطلع پر گھنگھور گھٹائیں جمع ہوتی رہیں اور دیکھتے دیکھتے پورے صوبے کی فضا پر چھا گئیں۔ مرکز نے

چپ سادھ لی اور مسٹر نورالامین کی حکومت نے معنی خیز خاموشی اختیار کرلی۔ ڈھاکا یونی ورسٹی میں یہ مواد پکتا رہا۔ یونی ورسٹی کے ہندو پروفیسر ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے۔ طلبہ کے اجتماعات میں شر انگیز تقریریں ہوتی رہیں۔ سرحد پار کے ایجنٹ اشتعال دلاتے اور بغاوت پر اکساتے کے لئے میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ سرکاری زبان کی تحریک چلانے کے لئے جو مجلس عمل بنی اُس میں ایسے لوگ جمع ہو گئے جو ابتدا ہی سے افتراق انگیزی کی ہر تحریک میں پیش پیش رہے ہیں۔ جو ملت کے مفاد کو اپنے ذاتی مفاد پر قربان کرنے میں کبھی نہیں ہچکچائے ـــ اور آخر کار ۲۱/ فروری کو عام ہڑتال کا اعلان ہی کر دیا۔" (قومی زبان۔ یکم مارچ ۱۹۵۲ء)

۲۱/ فروری کی شورش مسٹر نورالامین کی حکومت کی مجرمانہ خاموشی اور شورش پسندوں کے باغیانہ عزائم کی طرف چشم پوشی کا نتیجہ تھی۔ جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے۔ یونی ورسٹی اور کالجوں میں اندر ہی اندر یہ مواد پکتا رہا اور ہندو پروفیسر طلبہ اور طالبات کو نئی نئی ترکیبوں اور حیلہ سازیوں سے برابر اشتعال دلاتے رہے۔ حتیٰ کہ حرارتِ اشتعال انتہائی نقطہ پر پہنچ گئی، انھیں اپنے اوپر قابو نہ رہا اور عملی قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گئے اور جلوس نکالا۔ جلوس جس وقت یونی ورسٹی کے کھیل کے میدان کے پاس سے جا رہا تھا پولیس نے آنسو گیس چھوڑی اور لاٹھی چارج کیا۔ طلبہ منتشر ہو گئے اور مختلف راستوں سے گزر کر ناظم الدین روڈ پر جمع ہوئے اور جلوس کی شکل میں آگے بڑھنے لگے۔ طلبہ چونکہ منتشر ہو چکے تھے اس لئے یہ جلوس کچھ بڑا نہ تھا۔ شہر کے مختلف علاقوں میں لڑکوں کی مختلف جماعتوں نے احتجاجی جلسے کئے اور یہ اعلان کیا گیا کہ ۲۱/ فروری کو یونی ورسٹی کے سب طالب علم جمع ہوں گے اور پولیس کے ظلم کے خلاف احتجاج کریں گے۔

چنانچہ ۲۱/ فروری کو صبح کے نو بجے باوجودیکہ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ ہو چکا تھا۔ تمام کالجوں کے اور یونی ورسٹی کے طلبہ اور طالبات یونیورسٹی کے سامنے جمع ہوئے پولیس کے ظلم کی مذمت اور بنگلہ بھاشا کی تائید میں پُرجوش تقریریں کیں اور مطالبات پیش کئے۔ پولیس نے مجمع کو منتشر کرنے کی کوشش کی اور طالب علموں سے کہا کہ دو دو چار چار کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ لڑکے نہیں مانے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم جلوس نکالیں گے اور احتجاج کریں گے۔ چنانچہ جلوس نکلا اور بڑے جوش اور شان سے نکلا۔ جب یونی ورسٹی گیٹ سے نکلنے لگے تو پولیس نے بہت سوں کو گرفتار کر لیا اور ٹریکٹوں میں بھر کر لے گئے۔ کچھ کو تو جیل میں داخل کر دیا اور کچھ کو تیج گانو اور کومیلا اسٹیشن پر لے جا کر چھوڑ دیا۔ ان میں طلبہ اور طالبات دونوں شامل تھے۔ لیکن باوجود اس کے لڑکوں کا ہجوم کم نہ ہوا اور وہ میڈیکل کالج کی طرف جانے لگے۔ یہ واقعہ گیارہ بجے دن کا ہے۔ جب جلوس میڈیکل کالج کے سامنے سے ہو کر اسمبلی کی عمارت کی طرف جانے لگا تو پولیس نے آنسو گیس چھوڑی اور لاٹھی چارج کیا۔ جب اس پر بھی جلوس منتشر نہ ہوا اور میڈیکل کالج کے سامنے پہنچا تو پولیس نے گولی چلائی۔ اس میں چند لڑکے ہلاک اور کچھ زخمی ہوئے۔ گولی چلنے کے بعد کچھ لڑکوں نے بھاگ کر میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں پناہ لی اور کچھ کھیل کے میدان کی طرف بھاگ گئے۔ اسمبلی کے کچھ ممبر اسمبلی کی طرف جا رہے تھے۔ اُن لڑکوں نے جو میڈیکل کالج کے ہوسٹل میں رہ گئے تھے باہر نکل کر اُن ممبروں کی رکشاؤں کو روکا اور زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور اُن کی داڑھیاں پکڑ کر کھینچیں اور اُن سے ڈرا دھمکا کر اپنی منشا کے مطابق یہ لکھوا لیا کہ ہم بنگلہ بھاشا کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تائید کریں گے۔

۲۲/ فروری کی صبح کو میڈیکل کالج کے سامنے لوگ جمع ہوئے اور اُن لڑکوں

کی جو اس شورش میں ہلاک ہوئے تھے۔ غائب نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور اُن کے خُون آلود کپڑوں کا پرچم بنا کر جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس میں طلبہ کے ساتھ سکریٹریٹ کے عملے اور ڈھاکے کے عوام بھی شریک تھے۔ جلوس جب ہائیکورٹ کے سامنے آیا تو پولیس نے روکا۔ جب نہیں رُکا تو پہلے آنسو گیس چھوڑی اس کے بعد لاٹھی چارج کیا۔ اس پر بھی جلوس نہ رکا تو گولی چلائی۔ چند آدمی زخمی ہوئے۔ یہ "شہید ڈے" (یعنی یوم شہدا) کہلاتا ہے۔ اسی روز بعض شر انگیزوں نے "مورننگ نیوز" کے پریس میں آگ لگادی۔ سارا اثاثہ جل کر راکھ ہوگیا۔ کئی لاکھ کا نقصان ہوا۔ اور اخبار کئی روز تک ایک ورق پر کسی دوسرے پریس میں چھپ کر شائع ہوتا رہا۔ اس کا سارا قصور یہ تھا کہ اُردو کی تائید میں تھا۔

۲۲/ فروری کو شہر میں احتیاطاً فوج بلالی گئی۔ کرفیو نافذ کردیا گیا۔ چونکہ یہ سارا فساد طالب علموں نے یونیورسٹی کے پروفیسروں کے اشتعال دلانے پر کیا تھا لہٰذا مصلحت اس میں سمجھی گئی کہ یونی ورسٹی کے ہوسٹل بند کردیئے جائیں تاکہ لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں اور منتشر ہوجائیں۔ اس پر ارباب یونی ورسٹی کو مجبور کیا گیا اور یونی ورسٹی دو مہینے کے لئے بند کردی گئی۔

مسٹر نورالامین (وزیر اعلا) نے اس المناک سانحہ سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے۔ اس حادثہ کے فوراً بعد عزت مآب مسٹر نورالامین کی تحریک پر مشرقی بنگال اسمبلی میں بنگالی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانے کی تحریک منظور ہوگئی۔ "گویا (بقول مدیر قومی زبان) اتنی سی بات کے لئے یہ سوانگ رچایا گیا تھا۔" اور ایک عجیب ڈرامائی انداز سے بیس منٹ کے اندر یہ قرارداد منظور کرالی گئی۔ صرف تین نوجوانوں کے خون کا انتظار تھا غرض اولیت کا شرف انھیں حاصل ہوگیا۔ مگر افسوس کہ یہ تدبیر بھی ان کے کچھ کام نہ آئی اور اُن کی

وزارت کو نہ بچا سکی۔

خواجہ صاحب کے بعد محمد علی صاحب (بوگرا) وزارت عظمیٰ کی مسند پر جلوہ فرما ہوئے۔ آپ نے اس منصب عالی پر فائز ہوتے ہی بنگلا کی حمایت شروع کر دی ڈھاکے کے جلسہ عام منعقدہ ۲/جنوری ۱۹۵۳ء میں اعلان فرمایا کہ بنگلا کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کی خود میں سربراہی کروں گا۔ اس کے بعد ایک دوسرے موقع پر فرمایا کہ میں مشرقی پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے مجلس دستور ساز میں اس مطالبے کی حمایت کروں گا۔ یہ فرماتے وقت ان کو یہ یاد نہ رہا کہ وہ پاکستان کے وزیر اعظم اور کُل پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہیں۔ اور پاکستان کی وزارت عظمیٰ اور مسلم لیگ کی صدارت صرف مشرقی بنگال تک محدود نہیں۔ یہ معزز مناصب سارے پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جناب وزیر اعظم نے مشرقی پاکستان کے دورے میں ہر مقام پر ان ہی خیالات کا اظہار کیا اور لوگوں کے جذبات کو مشتعل فرماتے رہے۔ پروفیسر پنڈت شہید اللہ یا وزیر حبیب اللہ بہار صاحب یہ خدمت انجام دیتے تو ہمیں کچھ تعجب نہ ہوتا کیونکہ یہ دونوں صاحب اس فساد و نفاق کے بانیوں میں سے ہیں۔ لیکن وزیر اعظم پاکستان اور مسلم لیگ کے صدر کو اپنے تئیں مشرقی بنگال کا نمائندہ ظاہر کر کے بنگلا بھاشا کی تبلیغ کرنا اور لوگوں کو اشتعال دلانا بہت ہی نازیبا بات تھی۔ چنانچہ میں نے متواتر اس قسم کی اطلاعات پہنچنے پر ۹/فروری ۱۹۵۴ء کو ایک بیان اخبارات کو دیا جس میں جناب وزیر اعظم کی نسبت یہ الفاظ تھے:۔

"موصوف کو متحدہ پاکستان کی قومیت کا تصور ہی نہیں وہ اول و آخر صرف بنگالی ہیں۔ یہ بات ایسی مملکت کے وزیر اعظم کے منصب سے مطلق مناسبت نہیں رکھتی جب کہ وہ مختلف وحدتوں کا

وفاقی مجموعہ ہے۔ اگر وہ اپنے خاص صوبے کے مطالبات ہی کے
واسطے کوشش کرنے کے لئے اس درجہ بے قرار ہیں تو پھر وہ پورے
وفاق کے وسیع تر مقصد کی خاطر خواہ خدمات کیوں کر انجام دے سکیں گے
قومی وحدت کے خلاف جناب موصوف کا بنگالی زبان کی دعوت و
تبلیغ میں اس قدر جوش و خروش اس لئے اور بھی قابل گرفت ہے
کہ وہ کل پاکستان وفاق کی وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہیں۔ جناب
محمد علی صاحب کے لئے درست راستہ یہ تھا کہ وہ بنگلا تحریک کی
قیادت کرنے کے لئے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جاتے۔"

اس تحریک کی تہ میں جہاں اور کئی باتیں ہیں وہاں ایک خاص بات یہ تھی کہ
مشرقی بنگال کے انتخاب (الیکشن) میں چند ہی روز باقی تھے۔ بنگالیوں سے
ووٹ حاصل کرنے کے لئے بنگلا بھاشا کا حربہ سب سے زبردست تھا۔ انتخاب
کے ایام میں ووٹ بہت گراں قدر اور عزیز ہو جاتا ہے۔ جان سے بھی عزیز بلکہ
ایمان سے بھی زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وزیر اعظم نے اپنے بنگال کے
دورے میں جگہ جگہ اپنی تقریروں میں زبان کے مسئلہ کو خاص طور پر اچھالا۔ اور
لوگوں سے بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کا وعدہ کیا۔ اور غلط بیانیوں اور غلط
دلائل سے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً یہ کہ اگر صرف اُردو کو پاکستان کی
سرکاری زبان بنایا گیا تو مشرقی بنگال والے مغربی پاکستان سے صدیوں پیچھے
رہ جائیں گے۔ اور تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ ہو جائیں گے۔ اور
اس سے بھی زیادہ انھوں نے یہ غلط بیانی کی کہ اُردو مشرقی بنگال کے لئے "اجنبی
زبان" ہے۔ اگر یہ مشرقی بنگال کے لئے اجنبی زبان ہے تو مسلم لیگ کی طرف سے
انتخابی پروپیگنڈا اُردو میں کیوں کیا گیا؟ اُردو میں اخبار، اشتہارات، پوسٹر اور

پمفلٹ کیوں شائع کئے گئے۔ مغربی پاکستان کے مسلم لیگی لیڈر جو سارے بنگال میں تقریریں کرتے پھرتے تھے وہ کس زبان میں تھیں۔ سردار عبدالرب نشتر، قاضی عیسیٰ سردار شوکت وغیرہ نے انتخابی جلسوں میں کس زبان میں تقریریں کیں؟ مسٹر نورالامین بھی صوبے کے گوشے گوشے میں یہ اعلان کرتے پھرے کہ اگر تم بنگالی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنانا چاہتے ہو تو ہمیں ووٹ دو۔ افسوس یہ ہے کہ پاکستان کے بعض سیاسی رہنما اور مرکزی حکومت کے وزرا جو صوبائی الکشن کو مسلم لیگ کے حق میں کامیاب کرانے کی غرض سے دورے پر تشریف لے گئے تھے، وہ بھی اس تباہ کن تحریک میں شریک ہو گئے۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد۔ یہ کس قدر شرمناک حرکت ہے کہ وزیر اعلا نورالامین اور ان کے ہم خیال حضرات نے ملک کی عام خوش حالی، تعلیمی ترقی، آبادکاری، زرعی اصلاح وغیرہ اہم مسائل کو چھوڑ کر زبان کو انتخاب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن باوجود ان تمام نارو اکوششوں کے ان کی پارٹی کو سخت ذلت آمیز شکست ہوئی۔ خان عبدالقیوم خان نے بھی اسی لالچ میں بنگال پہنچ کر اپنے دورے میں بنگالی کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا بھی جو حشر ہوا وہ معلوم ہے۔ مایا ملی نہ رام۔

اپریل ۱۹۵۴ء کے اوائل میں مرکزی زبان کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں مسلم لیگ کی پارلیمانی پارٹی پر اس کا دارومدار تھا۔ مسلم لیگی حکومت تھی۔ اس پارٹی کا فیصلہ بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے ۸ر اپریل کو مغربی پاکستان کے ارکان دستور یہ کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ لکھا اور ان کو اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

جناب مکرم!

یہ امر نہایت قابل افسوس ہے کہ زبان کے مسئلے میں ناگوار حد تک اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے قبل بنگال نے کبھی اردو

کی مخالفت نہیں کی تھی۔ کلکتہ، ڈھاکا، مرشد آباد وغیرہ مقامات ایک زمانے میں اُردو کے مرکز رہے ہیں۔ اُردو ادب کے تذکروں میں بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر آتا ہے۔ وہاں کے شعرا کی زبان اُردو تھی اور اب بھی ہے۔ زمانۂ حال کے بنگالی مسلمان مثلاً نواب سلیم اللہ خاں مرحوم، نواب علی چودھری مرحوم، جناب خواجہ ناظم الدین نواب صاحب ڈھاکا، یہاں تک کہ مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کی زبان بھی اُردو ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بنگالی ٹوٹی پھوٹی جانتے ہوں لیکن اُردو کے بہت اچھے اور پُر اثر مقرر ہیں۔ اُردو کی مخالفت آج کل کی پیداوار ہے۔ اور اس کا باعث ایسے تلخ اور ناگوار واقعات ہیں جن پر بحث کرنا اس وقت ہم پسند نہیں کرتے۔

یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ موجودہ بنگالی زبان کسی صورت سے بھی سارے پاکستان کی سرکاری یا قومی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ بقیہ صوبوں کے لئے اجنبی زبان ہے۔ انگریزی سے بھی زیادہ اجنبی ہے۔ باقی زبانیں تو پھر بھی اپنے علاقے کی حد تک سرکاری زبان بننے کا امکان رکھتی ہیں۔ بنگالی کے لئے اس کا بھی قرینہ نہیں جب تک وہ کم سے کم اپنا رسم خط نہ بدلے۔ کیونکہ اپنے ظاہر و باطن کے اعتبار سے پاکستان کی کسی زبان سے میل نہیں کھاتی۔

یہ بالکل ظاہر ہے اور اس کے لئے کسی بحث و حجت کی حاجت نہیں کہ کوئی علاقائی زبان کُل پاکستان کی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ شرف اپنی پُرمائیگی، وسعت، بے پایاں صلاحیت، مقبولیت اور ہمہ گیری کی بنا پر صرف اُردو کو حاصل ہے۔" اُردو اور صرف اُردو ہی پاکستان کی

قومی زبان ہو سکتی ہے اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی" قائداعظم کا یہ قول دُور اندیشی اور صداقت پر مبنی ہے۔ اُردو پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کا سب سے قوی ذریعہ ہے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ آپ پاکستان کو انتشار سے بچانے اور اس کی سالمیت قائم رکھنے کی خاطر پوری قوت کے ساتھ اُردو کی حمایت کریں گے اور اکثریت کی بے جا ضد اور شور و غل سے مرعوب نہ ہوں گے اور پاکستان کی نمائندگی کا حق ادا کریں گے۔"

آخر وہ دن آہی گیا جس کا کھٹکا تھا۔ ۱۹/اپریل کو شب کے وقت لیگ کی پارلیمانی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اُردو کے ساتھ بنگالی بھی سرکاری زبان ہو گی۔ کئی روز سے ارکان مسلم لیگ سودے بازی کر رہے تھے۔ یہ بات بھی چھپی نہ رہی کہ مغربی پاکستان کے بعض لیگی ممبروں نے اس معاملے میں بڑی غداری اور پاک دشمنی کی۔ یہ سُن کر ہم کو اور جس نے بھی سُنا اس کو سخت حیرت اور صدمہ ہوا۔ معلوم یہ ہوا کہ اصول کوئی چیز نہیں مصلحت اور ذاتی مفاد اصل چیز ہے۔ ۱۹ر کی صبح کو اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی اور آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ ۱۲ بجے کے بعد جناب خلیل الرحمٰن صاحب مالک روزنامہ "جنگ" اور سید محمد تقی صاحب ایڈیٹر "جنگ" دفتر انجمن میں میرے پاس تشریف لائے اور اس المناک حادثے کا ذکر دلی رنج اور ملال کے ساتھ کرتے رہے۔ طے یہ ہوا کہ میں مسٹر محمد علی وزیر اعظم کو ایک خط لکھوں۔ مکمل ہڑتال کی عام اپیل کروں اور یہاں سے پرسوں ۲ بجے جلوس لے کر اسمبلی پہنچوں اور اپنا مطالبہ پیش کروں۔ چنانچہ دوسرے دن ۲۱ر کو میں نے وزیر اعظم کے نام یہ خط لکھا۔

"یہ خط میں جناب کی خدمت میں نہایت ادب سے لیکن پوری

ذمہ داری کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اس وقت لیگ پارٹی میں زبان کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ہے اُس سے عام طور پر لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ خلاف انصاف، خلاف عقل سلیم اور خلاف اُصول جمہوریت ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے اور جناب خود بھی اسے تسلیم کریں گے کہ کسی ایک علاقے کی زبان جو اُس علاقے سے باہر کہیں بولی اور سمجھی نہیں جاتی، سارے پاکستان کی زبان نہیں بن سکتی۔ یہ فیصلہ جو ہوا ہے صحیح غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ بعض مفاد طلب حضرات کے ذاتی اور خیالی مفاد پر مبنی ہے۔ یہ بات اب کوئی راز نہیں رہی، بچے بچے کی زبان پر ہے۔ یہ جتھے بندیاں پاکستان کی سلامتی کے لئے نہیں یہ اس کی تباہی کا سامان کر رہی ہیں۔ زبان کا مسئلہ معمولی نہیں اصل بنیادی مسئلہ ہے۔ اگر بقول قائد اعظم علیہ الرحمہ اُردو اور صرف اُردو کو پاکستان کی زبان تسلیم نہ کیا گیا تو پاکستان کا مطالبہ اور اُس کا وجود بے معنی ثابت ہوگا اور اس کا آدھا جسم مفلوج ہو جائے گا اس کا ایک نہایت خطرناک نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں میں پھوٹ پڑ جائیگی اور خود غرض اور پاکستان دشمن گروہ کو نفاق و افتراق پھیلانے کا موقع ملے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ بنگلا زبان اپنے ظاہر اور باطن کے اعتبار سے بنگال سے باہر کہیں قبول نہیں کی جائے گی۔ دستور ساز مجلس کے منظور کرنے پر بھی اس کا رواج محال ہے لیکن ہوگا یہ کہ اس سے پاکستان کے طول و عرض میں پاکستان حکومت کی طرف سے بد دلی، بے اعتمادی اور بغاوت پیدا ہوگی اور اس کا سارا الزام آپ کی ذات پر ڈالا جائے گا۔ لیگ سے لوگ پہلے ہی سے بدگمان اور اسے ایک

مردہ جماعت سمجھتے ہیں۔ اسمبلی، پارلیمنٹ اور دستور ایسے نام ہیں جنھیں لوگ سنتے سنتے بیزار ہو گئے ہیں اور مہمل خیال کرنے لگے ہیں پر اب بھی اپنے وزیر اعظم یعنی آپ پر اعتماد رکھتے ہیں۔ اگر آپ نے اس موقع پر اخلاقی جرأت اور استقلال سے کام نہ لیا تو خاکم بدہن پاکستان کی سالمیت کی خیر نہیں۔ پاکستان پر جو گزرے گی سو گزرے گی مگر خوف ہے کہ سب سے پہلے اس کا وبال آپ پر پڑے گا۔ اردو بہت بڑی قوت ہے۔ اس کے شیدائی اور فدائی سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے پاکستان کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں اور اب بھی ویسی ہی قربانیاں کرنے کو تیار ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس فیصلے سے لوگوں کے دلوں میں کیسا غم و غصہ ہے۔ کچھ دنوں سے جو خط مجھے وصول ہو رہے ہیں اور صبح سے شام تک جو لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر ایک آگ سلگ رہی ہے جو نہ معلوم کس وقت بھڑک اُٹھے۔

اب بھی وقت ہے۔ آپ اب بھی اصلاح فرما سکتے ہیں۔ اور کچھ نہیں تو کم سے کم اس مسئلے کو اس وقت تک ملتوی رکھ سکتے ہیں جب تک کہ نئے انتخاب ہوں جس طرح خواجہ ناظم الدین صاحب نے اسے ملتوی کر دیا تھا یا جیسا کہ خود آپ نے پسند کیا تھا قومی زبان کا فیصلہ استصواب رائے عامہ پر منحصر کر سکتے ہیں۔ اس عرصے میں لوگوں کے جذبات دھیمے پڑ جائیں گے اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو یہ آپ کی سیاسی حکمت کا بڑا کارنامہ ہوگا اور آپ حکومت کی ڈانواں ڈول

کشتی کو سلامتی کے ساتھ ساحل مراد تک لے جائیں گے ۔"

ظاہر ہے کہ ایسے خط کا اثر وزیر اعظم محمد علی جیسی ذہنیت کے شخص پر کیا ہو سکتا ہے ۔ آخر ہمیں مسلم لیگ پارٹی کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا پڑا ۔ اور احتجاج کی وہ صورت اختیار کرنی پڑی جو آخری نوبت پر مجبوری کی حالت میں اختیار کرنی پڑتی ہے ۔ شب کو ایک مختصر مشاورتی جلسہ خاص اصحاب خواتین کا انجمن ترقی اردو کالج کے ہال میں منعقد ہوا ۔

اس میں مولانا احتشام الحق، مولانا عبد الحامد بدایونی، منظر عالم صاحب اور دیگر اصحاب نیز بعض خواتین نے بہت پُرجوش تقریریں کیں ۔ اے ۔ ایم قریشی صاحب نے پوری مدد دینے کا وعدہ کیا اور کہا میرے ٹرک اور بسیں اس خدمت کے لئے حاضر ہیں ۔ اس پر اہلِ جلسہ نے بڑے زور سے چیرز دیئے ۔ کل کے جلوس اور ہڑتال کے متعلق بعض امور طے ہوئے ۔ نیز یہ طے پایا کہ کل صبح ساڑھے چھ بجے حاضرین میں سے بعض اصحاب اور دیگر کارکن اور خاص خاص طلبہ انجمن کے دفتر میں جمع ہو جائیں ۔ اُس وقت ان کو جلوس اور ہڑتال کے متعلق ہدایتیں دی جائیں گی ۔

اِدھر ہمارا یہ جلسہ ہو رہا تھا، اُدھر سے چیف کمشنر صاحب اور حکومت کے بعض ذی اقتدار اصحاب کی طرف سے فون، پیغام اور خط آنے شروع ہوئے ۔ چیف کمشنر صاحب نے فون سے فرمایا کہ ہڑتال اور جلوس ملتوی کر دیا جائے تو مناسب ہوگا ۔ آپ ہر چند احتیاط کریں لیکن بعض غنڈے اور بدخواہ پاکستان اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر فساد پیدا کر دیں گے اور کشت و خون کی نوبت آجائے گی ۔ نیز کل سلطان ابنِ سعود لاہور سے آنے والے ہیں، یہ بہت بدنما بات ہوگی کہ اُس روز ہڑتال ہو اور جلوس نکلے ۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ ہم امکان بھر کوشش کریں گے کہ کسی قسم کا ہنگامہ نہ ہونے پائے ۔ لیکن وہ التوا کے لئے برابر

اصرار کرتے رہے۔ سید ہاشم رضا صاحب بھی بھیجے ہوئے آئے اور انھوں نے بھی وہی باتیں کہیں جو چیف کمشنر صاحب فرما چکے تھے۔ میں نے ان کو بھی پوری طرح اطمینان دلایا کہ کوئی فساد اور ہنگامہ نہیں ہوگا۔ اور اب ہڑتال یا جلوس کو ملتوی کرنا ممکن نہیں۔ ہاں اگر پولیس کی طرف سے شرارت ہوئی تو بلاشبہ ہنگامہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور بہت بڑا فساد ہوگا۔ رات کو گیارہ بجے چیف کمشنر صاحب نے اپنے سکریٹری کو بھیجا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ جو عزم ہم نے کیا ہے اس سے نہیں ہٹ سکتے۔ غرض رات گئے تک اسی قسم کے نامہ و پیام ہوتے رہے۔ دوسرے دن صبح کو کچھ حضرات تشریف لائے۔ ان میں بعض تو "بھیجے ہوئے" معلوم ہوتے تھے اور بعض میرے خاص ملنے والے تھے جو محض ہمدردی کے خیال سے آئے تھے اور سمجھاتے رہے کہ یہ صورت بہت خطرناک ہے ایسا نہ ہو کر فساد برپا ہو جائے میں نے ان صاحبوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ بغیر خطرہ مول لئے کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ جو ہم نے سوچا ہے وہ ہو کے رہے گا۔ جو قدم آگے بڑھ چکا ہے وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ لیکن ایسے اصحاب بھی آئے جنھوں نے ہماری تحریک سے ہمدردی کی اور خلوص دل سے ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ بعض نے اپنے خون سے نوشتے لکھ کر دیئے۔

اگرچہ وقت بہت کم تھا اور تشہیر کے وسائل بھی کافی نہ تھے۔ صرف شب درمیان تھی۔ باوجود اس کے یہ نحیف آواز آناً فاناً میں نہایت تیزی کے ساتھ دارالحکومت کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ اس ہڑتال کی چشم دید کیفیت جو اخبار کے نمائندے نے لکھی ہے اُسے نقل کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

"اُردو کی مرکزی حیثیت کو ختم کرنے کی جو سازش اقتدار پسند حلقوں میں کی گئی تھی اس کے خلاف عوام میں اس قدر اضطراب تھا کہ صبح

سویرے ہی سے لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ انھوں نے بطیب خاطر ایک دن کے لئے اپنا کاروبار معطل کر دیا۔ ہر طرف اسمبلی پارٹی کے ناعاقبت اندیشانہ فیصلے کے خلاف اظہار نفرت و برہمی کیا جا رہا تھا۔ دکانیں، بازار، تجارتی دفاتر، صرافہ، اسکول و کالج بند ہو گئے تھے۔ تاجروں، لیڈروں، طلبہ اور مختلف انجمنوں نے بابائے اردو کی اپیل کی تائید میں بیانات جاری کئے تھے جن میں ہڑتال کو کامیاب بنانے کی درخواست کی گئی تھی۔ طلبہ نے یونیورسٹی کے امتحانات کا مقاطعہ کیا۔ شہر کی ساری چہل پہل ختم ہو گئی۔ اخبار نویسوں اور سیاسی رہنماؤں کا خیال ہے کہ کراچی کی سیاسی زندگی میں آجتک ایسی مکمل ہڑتال نہیں دیکھی گئی تھی۔

بعض جگہ اہل سازش کے کارندوں نے کوشش کی کہ ہڑتال کو ناکام بنایا جائے۔ چنانچہ اکثر دکانداروں پر سختی کی گئی کہ اپنی دکانیں کھولیں مگر تفرقہ اندازوں کو اس میں سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور کسی شخص نے اس قومی تحریک سے علیحدہ ہونا گوارا نہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بعض مقامات پر ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کو دھمکا کر گاڑیاں چلانے پر مجبور کیا گیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔

مکانات کی چھتوں پر اور بند دکانوں کے سامنے جا بجا سیاہ جھنڈے لہرا رہے تھے۔ بلدیہ کراچی کے کارکنوں نے اس دن کام نہیں کیا۔ بہت سی عدالتیں بند رہیں اور بلدیہ پر ماتمی جھنڈا لگا دیا گیا جو دارالحکومت کے شہریوں کے رنج و غم کی علامت بن گیا تھا۔ قومی زبان کے نمائندے نے بعض مقامات پر لوگوں کو زار و قطار روتے دیکھا۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی

کے فیصلے سے ان کے سینے فگار تھے۔ انھیں یہ امید نہ تھی کہ وہ جماعت جو پاکستان کے قیام و انصرام کی ذمہ دار ہے اس قسم کی ملت شکن تحریک منظور کرے گی۔ بنگلا کو اردو کے ساتھ قومی زبان کی حیثیت دینے کے تصور ہی سے ہر شخص بیزار نظر آتا تھا۔ قومی زبان کے نمائندہ نے عوام کے مختلف طبقات کے نمایندوں سے ملاقات کی بعض طبقات میں سیاسی، علمی یا معاشرتی مسائل میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں مگر اردو کے معاملے میں وہ سب متفق تھے۔ باہمی اختلافات کو ختم کر دیا تھا اور بابائے اردو مدظلہم کی سرکردگی میں اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا عزم صمیم رکھتے تھے۔ سیاسی مد و جزر پر نظر رکھنے والے تجربہ کار اور اہل الرائے اصحاب کا خیال تھا کہ اس مسئلے پر جس حد تک عام اتفاق رائے پایا جاتا ہے وہ بے مثال ہے۔ انجمن ترقی اردو کے دفتر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہر شخص بابائے اردو کے حکم کا منتظر اور ان کے فیصلے کو معلوم کرنے کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ بالمشافہ اور خطوں، تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعے ان گنت لوگوں نے انجمن کو اس جد و جہد میں اپنے کامل تعاون کا یقین دلایا تھا بعض صاحبوں نے اپنے خون سے دستخط کرکے بابائے اردو کی خدمت میں بھیجے تھے اور یقین دلایا تھا کہ اردو کے لیے آپ کے حکم ملنے پر جان کی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا جائے گا۔ بعض جوانمرد اشخاص اور بہادر خواتین تا مرگ فاقہ کشی کی اجازت کے طالب تھے بابائے اردو کی طرف سے اُن کو یہی جواب دیا گیا کہ جب ان کی خدمات کی ضرورت ہوگی تو ضرور ان کو زحمت دی جائے گی۔"

چونکہ اس امر کا اعلان ہو چکا تھا کہ ۲۲ کو شام کے چار بجے مجلس دستور ساز کے اجلاس میں مسلم لیگ پارٹی کی منظور کردہ قرارداد پیش کر کے اس پر ایوان کی مہر تصدیق ثبت کر دی جائے گی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اپنے رفقا اور محبان اردو اور بعض طلبہ کی معیت میں دفتر انجمن سے پا پیادہ مجلس دستور ساز تک جائیں گے اور وہاں اپنا مطالبہ پیش کریں گے اور ارکان مجلس کو سمجھائیں گے کہ مسلم لیگ پارٹی کی قرارداد پاکستان کی سالمیت کے حق میں سراسر مضر اور قومی خود داری کے بالکل خلاف ہے۔ ایک علاقائی زبان کو سارے پاکستان کی سرکاری زبان بنانا ناقابل عمل اور غیر معقول ہے۔ نیز بیس برس تک ملک پر انگریزی زبان مسلط رکھنا پاکستان کی آزادی کے منافی اور قوم کی شدید تذلیل ہے۔ اب میں اس جلوس کا حال نمائندہ قومی زبان کی تحریر سے نقل کرتا ہوں جو بذاتِ خود جلوس کے ساتھ تھے:۔

"اس ارادے کے مطابق تین بجے سہ پہر کو بابائے اردو چند رفیقوں کی معیت میں مجلس دستور ساز کے ایوان تک جانے والے تھے مگر اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر ہزارہا آدمی عورت ، مرد وقت مقررہ سے بہت پیشتر دفتر انجمن کے صحن اور ملحقہ میدان اور سڑکوں پر جمع ہو گئے تاکہ بابائے اردو کے ہمراہ جائیں۔ عوام کو اس کی دعوت نہیں دی گئی تھی پھر بھی انجمن کے دفتر سے نکلتے نکلتے ساٹھ ستر ہزار افراد کا اجتماع ہو گیا اور دستوریہ تک پہنچتے پہنچتے یہ تعداد تخمیناً ایک لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔ ٹھیک پونے تین بجے بابائے اردو ترکی ٹوپی پہنے سفید شیروانی میں ملبوس چھڑی ہاتھ میں لئے رفقا کے ساتھ برآمد ہوئے۔ مجمع نے "بابائے اردو زندہ باد"۔ "اردو زندہ باد"۔ "ایک

ملت ایک زبان۔" "پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی۔" "اردو کے غدار پاکستان کے دشمن ہیں۔" "مفاد پرست مردہ باد" کے نعروں میں بابائے اُردو کو جلوس کی اگلی صف میں پہنچایا۔ پندرہ منٹ میں ہجوم نے صفیں مرتب کرلیں۔ مولانا احتشام الحق نے جو اس وقت تشریف لے آئے اپنی دعاؤں کے ساتھ جلوس کو رخصت کیا۔ بابائے اُردو کے ساتھ ساتھ ایک صاحب سیاہ جھنڈا اُٹھائے چل رہے تھے۔ ہر شخص کے بازو پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ جلوس والے بہت سے تختے اور جلی قلم کے اشتہار لئے ہوئے تھے۔ جن پر یہ عبارتیں لکھی ہوئی تھیں:-

"پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔"

"محمد علی قائد اعظم اور قائد ملت کے نقش قدم پر چلیں یا مستعفی ہوجائیں۔"

"لیگ پارٹی کا فیصلہ قوم کے لئے ناقابل قبول ہے۔"

"اُردو کا دشمن پاکستان کا دشمن ہے۔"

"بنگلا اُردو کے ساتھ سارے پاکستان کی زبان نہیں ہوسکتی۔"

"اُردو پاکستان کے اتحاد و سالمیت کی علامت ہے۔"

"اُردو کو واحد قومی زبان نہ بنایا گیا تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیگا"

"جلوس آہستہ آہستہ انجمن کے ملحقہ میدان سے نکل کر پرنس اسٹریٹ ہسپتال روڈ سے گزر کر بندر روڈ میں داخل ہوا اور وہاں سے سعید منزل ہوتا ہوا پریڈی اسٹریٹ کے رستے صدر میں آگیا۔ اس کے بعد فریر روڈ سے گزرتا ہوا گورنمنٹ زنانہ کالج کے قریب کورٹ روڈ کی طرف مڑ گیا

اور دستور یہ کی عمارت میں پہنچا۔ سارے راستے عوام حکومت کی نااہلی اور مسلم لیگ کی ناعاقبت اندیشی کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ "اُردو زندہ باد"، "بابائے اُردو زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے ساری کراچی گونج اُٹھی۔ اس انتہائی جوش اور بے پناہ کثرت کے باوجود جلوس نے کامل ضبط و نظم کا مظاہرہ کیا۔ جلوس کے آگے ٹرک میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ جلوس کے منتظمین مجمع کو سلیقے اور باقاعدگی کے ساتھ آگے بڑھنے کی ہدایت دے رہے تھے۔ ۲۲/اپریل کی یہ گرم سہ پہر کراچی کے باشندے کبھی نہ بھلا سکیں گے جب کہ ایک لاکھ سے زائد پرجوش محبانِ اُردو نے ذمہ دارانِ نظم و نسق کے اس اندیشے کو باطل کر دیا کہ اس قسم کے جلوس کا امن و سکون کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔

کارپوریشن کی جانب سے پانی کے چند ٹرک بہم پہنچائے گئے تھے جو جلوس کے ہمراہ تھے۔ گرمی اور نعرے لگانے سے لوگوں کے گلے خشک ہو جاتے تو پانی پی کر دوبارہ جلوس میں آ ملتے۔ ایسے میں ایک چھوٹا سا جلوس تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل بابائے اُردو کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس جلوس میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کو جنازے کی شکل دے کر آگے آگے لے جایا جا رہا تھا۔ اسے مسلم لیگ پارٹی کی عقل و تدبّر کا جنازہ قرار دیا گیا تھا۔ اس جلوس کے شرکا ارکان اسمبلی کے فہم و تدبّر کا ماتم کرتے چلے جا رہے تھے اور باقاعدہ سینہ کوبی کر رہے تھے۔"

غرض یہ عظیم الشان مجمع دستور یہ کے وسیع کمپونڈ میں داخل ہو گیا جہاں بغیر اجازت قدم رکھنا ممنوع ہے۔ اسمبلی کے دروازے پر پولیس کے تقریباً تین صد

خود پوش پیادے لوہے کی شامی لگی لاٹھیاں اُٹھائے صف بستہ حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ فائر بریگیڈ کا انجن حاضر تھا۔ بندوقچیوں کا ایک دستہ بھی عمارت کی پشت پر موجود تھا تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔ میں جب ایوان اسمبلی کے دروازے پر پہنچا تو وزیر اعظم کے معتمد ذات اور افسر رابطہ پیشوائی کو آئے اور مجھے اس کمرے میں لے گئے جہاں اسمبلی کے ارکان تشریف رکھتے تھے۔ میرے پہنچنے پر چند منٹ خاموشی طاری رہی۔ کسی لیگی "مردوے" کی تو ہمت نہ ہوئی البتہ شاہنواز بیگم صاحبہ آگے بڑھ کر میرے پاس آکر بیٹھ گئیں اور انھوں نے وہی پامال فرسودہ دلائل پیش کرنی شروع کیں جن کی بارہا تردید کی جا چکی ہے۔ سارا زور اکثریت پر تھا۔ ان لوگوں کی سمجھ میں اتنی ذراسی بات نہیں آتی کہ کوئی علاقائی زبان ساری مملکت کی سرکاری زبان نہیں ہو سکتی۔ خاص کر ایسی علاقائی زبان جو ہر اعتبار سے پاکستانی زبانوں سے متغائر اور اپنی ظاہری صورت اور باطنی اوصاف کی رُو سے باقی علاقوں کے باشندوں کے لئے نامانوس و ناگوار ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم سے کم بہروپ ہی بدل کے آتی یعنی اپنا رسم خط بدل لیتی تو ایک گونہ اجنبیت کم ہو جاتی لیکن اہلِ بنگال کو یہ بھی منظور نہیں بلکہ اس کی سخت مخالفت کی جاتی ہے! اور یہ جو اکثریت کی رَٹ لگا رکھی ہے بالکل بے معنی ہے۔ یہ کیسی اکثریت ہے جسے اپنے گھر سے باہر اقلیت بھی نصیب نہیں مشرقی بنگال سے باہر نہ اسے کوئی بولتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ یہ کیونکر سارے پاکستان کی زبان ہو سکتی ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ سرحد کا پٹھان اپنے بیٹے یا بیٹی کو بنگالی زبان پڑھائے گا۔ قطع نظر ان تمام اُمور کے دو سرکاری زبانیں بنانے سے عام نظم و نسق، عدالتی کارروائیوں اور خصوصاً فوجی احکام اور ڈرل پریڈ میں کیسے کام چلے گا۔ پنجاب کے نمائندوں نے جو اس معاملے میں بے اُصولی اور غداری برتی اس پر میں نے بہت لعنت ملامت

کی خصوصاً اس لیئے کہ اُن ہی سے یہ توقع تھی کہ وہ سب سے زیادہ اُردو کی حمایت کریں گے۔ اس پر بیگم صاحب نے یہ فرمایا کہ ہمارے سامنے جو مشکل ہے اس کا حل بتائیے۔ میں نے کہا مشکل کا حل آپ کا کام ہے۔ ہم صرف اپنا نقطۂ نظر پیش کر سکتے ہیں۔ اور آپ نے جو پارلیمنٹ، اسمبلی، لیگ اور حکومت کے مختلف شعبوں کے جال پھیلا رکھے ہیں جن میں بڑے بڑے مدبّر اور سیاست داں کار فرما ہیں، یہ کس مرض کی دوا ہیں جو آپ مشکل کا حل ہم سے پوچھتی ہیں۔ غرض اسی قسم کی کچھ گفتگو کے بعد میں نے کہا آپ اپنی مشکلات اور تجویزیں لائیے۔ ہم اُن پر غور کریں گے اور ہماری جو رائے ہوگی اس سے آپ کو مطلع کر دیں گے۔ غرض طے یہ ہُوا کہ میں اور میرے رفیق کل ۹ ½ بجے وزیر اعظم سے ملیں اور اس مسئلہ پر گفتگو کریں۔

میں اوپر یہ گفتگو کر رہا تھا اور نیچے ایوان اسمبلی کے ممنوعہ کمپونڈ میں ہجوم نے اپنا مظاہرہ برابر جاری رکھا۔ اسمبلی کے احاطہ کی دیوار، اندر کا صحن، باہر کی سڑکیں میکلوڈ روڈ سے زبیر روڈ تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ اسمبلی کی بالائی منزل کے برآمدے اخبار نویسوں اور معززین سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں اسمبلی کے سامنے والے برآمدے کے ایک در میں لاؤڈ اسپیکر لگا یا گیا۔ اندر کمرے سے نکل کر جب میں اس مقام پر پہنچا تو ہجوم نے "زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کیئے۔ کئی منٹ کے بعد جب شور کم ہوا تو میں نے ہجوم سے مخاطب ہو کر یہ اعلان کیا کہ ہم سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ بغیر ہمارے مشورے کے کوئی فیصلہ زبان کے بارے میں نہیں کیا جائے گا۔ اور آج کا اسمبلی کا اجلاس جس میں یہ مسئلہ پیش ہونیوالا تھا ملتوی کر دیا گیا ہے۔ اور کل صبح ہمیں مذاکرات کے لیئے مدعو کیا گیا ہے۔ مجمع نے بے تحاشا نعرے لگانے شروع کیئے کہ فیصلہ ابھی ہونا چاہیئے اور ہم جب تک اس کا فیصلہ نہ ہوگا یہاں سے نہیں جائیں گے۔ میں نے کہا کہ مفصل گفتگو کیئے بغیر

فیصلہ ممکن نہیں لہٰذا آپ حضرات خاموشی سے چلے جائیں مگر شور اس قدر تھا کہ کسی نے کچھ نہ سُنا۔ اتنے میں اُن کی نظر وزیر اعظم صاحب پر پڑی جو میرے قریب آ گئے تھے تو ہجوم نے نعرے لگانے شروع کیے اور کہا کہ وزیر اعظم مسٹر محمد علی صاحب کو سامنے لایا جائے۔ وزیر اعظم مسکراتے ہوئے آگے بڑھے دونوں ہاتھوں سے سلام کیا اور مائیکروفون سے ہجوم کو خطاب کرنا چاہا مگر مجمع میں برہمی پیدا ہو گئی اور جب شور کم نہ ہوا تو واپس چلے گئے۔ اب بڑی مشکل یہ آ پڑی کہ اس مجمع کو کس طرح آمادہ کیا جائے کہ وہ خاموشی سے چلے جائیں۔ آخر جب یہ کہا گیا کہ جہانگیر پارک چلو وہاں اس تمام گفتگو کا خلاصہ بیان کیا جائے گا جو ارکان لیگ سے کی گئی ہے۔ اس پر وہ رضامند ہو گئے۔ اس اثنا میں اوپر کی منزل سے نیچے آیا تو کئی حضرات فرطِ محبت اور جوش سے میرے قدموں میں لوٹنے لگے اور زار زار روتے اور کہتے تھے کہ "بابا اردو کا کیا ہوگا"۔ یہ بہت ہی درد انگیز منظر تھا۔ جہانگیر پارک پہنچنے کے بعد مجمع میں بالکل سکون تھا۔ میں نے جو کچھ گزرا تھا سب بیان کر دیا اور کہا کہ کل ہمیں گفتگو کے لئے بلایا گیا ہے اور ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہمارے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ میں نے مجمع کو اطمینان دلایا کہ ہم اردو کے لئے برابر لڑتے رہیں گے اور اس کے حق کو منوا کے چھوڑیں گے۔ کیونکہ اُردو کے سوا کوئی علاقائی زبان پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہونے کا دعوا نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد مجمع خاموشی سے منتشر ہو گیا۔

یہ عظیم جلوس جو میرے ساتھ مجلس دستور ساز تک گیا اس کی مثال اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ جلوس انسانوں کا ایک بہتا ہوا سمندر تھا لیکن جس ضبط و نظم کا مظاہرہ جلوس میں حصہ لینے والوں کی طرف سے کیا گیا وہ ملک کی سیاسی جماعتوں کے لئے ایک سبق اور عوام کے لئے ایک زندہ مثال رہے گا۔

مجمع میں نظم و ضبط قایم رکھنے اور لوگوں کے پُرسکون رہنے میں جناب منظر عالم صاحب ایڈوکیٹ، جناب احمد شجاع زیبا ایڈیٹر قومی زبان۔ کنوینر متحدہ محاذ پرنسپل آفتاب حسن صاحب، جناب خلیل الرحمن صاحب مدیر جنگ، جناب عمر فاروقی صاحب مدیر انجام، جناب پردیسی صاحب مدیر نوروز، جناب مختار آزاد صاحب، مدیر الحجاز و دیگر معززین نے بڑی مدد دی۔ خواتین میں بیگم سید عبد الحفیظ بیگم محمد شریف، بیگم ارجمند قزلباش، بیگم نجمہ، بیگم زینب عبد اللہ، بیگم اصغری رحیم نے جلوس کی تنظیم اور لوگوں کو ہڑتال پر آمادہ کرنے پر سخت محنت اور تکلیف برداشت کی۔ نیز طلبہ بالخصوص طلبائے انجمن ترقی اردو کالج، وکلا، اساتذہ، تجار اور اخبار نویسوں نے مظاہرے کو کامیاب بنانے میں جو خدمات انجام دیں وہ کمال تحسین اور شکر گزاری کی مستحق ہیں۔

۱۴/ اپریل کو حسب قرارداد میں، جناب منظر عالم، جناب خلیل الرحمن و جناب عمر فاروقی صاحبان کے ساتھ وزیر اعظم صاحب کے دولت کدہ پر گئے۔ جناب وزیر اعظم صاحب، جناب شعیب قریشی صاحب اور جناب چودھری محمد علی صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ چودھری صاحب نے مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کی تجاویز ہمیں دیں۔ میں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ ان تجاویز کے مرتب کرنے، غور کرنے اور طے کرنے میں بہت کافی دن لگے ہوں گے۔ ہمیں بھی ان پر غور کرنے کے لئے کچھ وقت ملنا چاہیئے۔ ہم ایک ہفتے میں اپنی قطعی رائے پیش کر دیں گے۔ چودھری صاحب نے فرمایا کہ وزیر اعظم صاحب ۲۶/ اپریل کو لنکا جا رہے ہیں۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جہاں تک جلد ممکن ہو اس سے قبل ہی یہ معاملہ طے کر لیا جائے۔ کچھ رد و کد کے بعد یہ قرار پایا کہ ہم کل ۱۵/ کو ۳ ½ بجے آکر گفتگو کریں گے۔

ہم نے اس بارے میں اپنی کمیٹی سردار عبد الرب نشتر صاحب کے مکان پر

سوا پانچ بجے کی اور دیر تک اس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی۔

دوسرے دن ۲ ½ بجے جناب خلیل الرحمٰن صاحب اور جناب عمر فاروقی صاحب آئے اور کچھ دیر لیگ پارٹی کی تجاویز پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ ۳ ½ بجے ہم وزیر اعظم صاحب کے مکان پر پہنچ گئے۔ فخر ماتری صاحب ایڈیٹر ملّت گجراتی بھی آملے۔ اس صحبت میں میرے ساتھ علاوہ ان دو صاحبوں کے مولوی سیّد ہاشمی اور منظر عالم صاحب بھی تھے۔ میں نے اپنا نوٹ وزیر اعظم صاحب اور چودھری صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نوٹ میں مسلم پارٹی کی تجاویز پر تنقید اور اپنی رائے تھی۔ اس پر کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔ ساری گفتگو حکومت کی طرف سے چودھری محمد علی کرتے رہے۔ چودھری محمد علی بیچ میں بیٹھے تھے۔ شعیب قریشی صاحب ان کی دہنی طرف اور وزیر اعظم محمد علی صاحب ان کی بائیں جانب تشریف رکھتے تھے۔ یہ دونوں صاحب اس تمام گفتگو میں خاموش بیٹھے رہے۔ البتہ ایک بار دوران گفتگو میں وزیر اعظم محمد علی صاحب نے فرمایا کہ بی۔ اے میں میری زبان اُردو فارسی تھی۔ بنگالی میں اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا۔ اس پر مولوی سید ہاشمی صاحب نے کہا کہ سارا فساد تو آپ ہی نے مشرقی بنگال میں پیدا کیا ہے۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے۔ غرض اس نشست میں حکومت کی طرف سے سب کچھ چودھری محمد علی صاحب نے کہا سُنا۔ بہر حال اس گفت و شنید کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صاحبوں نے اپنی تجاویز میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ اوّل میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا پہلا فارمولا (ضابطہ) لکھتا ہوں۔ اس کے بعد اپنا وہ اختلافی نوٹ نقل کروں گا جو وزیر اعظم اور ان کے دونوں رفقا کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ آخر میں وزیر اعظم کمیٹی کا دوسرا فارمولا پیش کروں گا جو اس نے میرے اختلافی نوٹ کے بعد مرتب کیا۔

---

# مسلم لیگ پارلیمانی کمیٹی کا فارمولا (ضابطہ)

۱ ۔ جمہوریہ کی سرکاری (آفیشل) زبانیں اُردو اور بنگالی ہوں گی۔ اور ایسی صوبائی زبانیں جنھیں صوبے کا گورنر صوبہ کی مجلس دستور ساز کی سفارش پر سرکاری ہونے کا اعلان کرے گا۔

۲ ۔ اُردو اور بنگالی مرکزی پارلیمنٹ کی زبانیں تسلیم کی جائیں گی۔

۳ ۔ باوجود اس کے انگریزی زبان دستور کے آغاز سے بیس سال تک جمہوریہ کی اُن تمام سرکاری اغراض کے لئے استعمال ہوتی رہے گی۔ جن کے لئے وہ دستور کے آغاز سے فوراً قبل ہوتی رہی۔

۴ ۔ مرکزی ملازمتوں کے لئے تمام صوبائی زبانوں کا درجہ مساوی رکھا جائیگا۔

۵ ۔ مدارس ثانوی میں عربی اور اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ طالب علم علاوہ اس زبان کے جو ذریعۂ تعلیم ہے یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک زبان لے سکیں۔

۶ ۔ حکومت کو ایک قومی زبان کی نشوونما اور ترقی کے لئے تمام تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

۷ ۔ دستور کے نفاذ سے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو سفارش کرے گا کہ انگریزی زبان کی بجائے کس زبان کو رکھا جائے۔

۸ ۔ باوجود مندرجہ بالا دفعات کے وفاقی مجلس وضع قوانین از روئے قانون انگریزی زبان کو آغاز دستور سے بیس سال منقضی ہونے پر اُن اغراض کے استعمال کے لئے مزید اجازت دی جاسکتی ہے۔ جن کی تصریح قانون میں کی گئی ہو۔

## میری تنقیحات

میں یہ ابتداء ہی میں جتا دینا چاہتا ہوں کہ "ہندستانی مسلمانوں" کے لئے قومی زبان کا مسئلہ ایک صدی بلکہ اس سے پہلے ہی قطعی طور سے طے ہو چکا تھا۔ کیونکہ انگریزوں کے تسلط کے بعد اردو فارسی کی بجائے سندھ سے۔ لے کر سلہٹ اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک مروج ہو گئی تھی۔ تقسیم کے وقت دوست دشمن سب یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جدید اسلامی حکومت کی سرکاری زبان لامحالہ اردو ہو گی۔ بانی پاکستان نے علانیہ طور پر نہایت پُر زور غیر مبہم الفاظ میں اس کی توثیق کی۔ میری انجمن اس قطعی اور ناطق فیصلے کی کامل طور پر پابند ہے۔ باوجود اس کے میں نے ہمیشہ اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ زبان کے مسئلے میں پاکستان کی مسلم قوم کی استصواب رائے سے فیصلہ کیا جائے اس موقع پر میں اس کا بھی اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے علاقائی زبانوں کی نشوونما و ترقی سے کبھی اختلاف نہیں کیا اور اگر یہ زبانیں اپنے علاقوں میں سرکاری طور پر استعمال کی جائیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔

اس نہایت کم وقت میں میں حکومت کی تجویزوں کے متعلق اپنے صرف چند احباب سے مشورہ کر سکا۔ ہماری رائے میں فقرہ نمبر ۱ اردو کے حق میں توہین آمیز ہے اور اس سے لوگوں میں شدید ناراضی اور ہیجان پیدا ہو گا۔ میری کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ یہ فقرہ ان تجاویز سے خارج کر دیا جائے۔

اگرچہ میری کمیٹی فقرہ نمبر ۲ کو سخت ناپسند کرتی ہے تاہم اگر حکومت اس پر عمل کرنا چاہے گی تو وہ اس کی راہ میں حائل نہ ہو گی۔

فقرہ نمبر ۳ سے بعد میں بحث کی جائے گی۔

فقرہ نمبر ۴ فقرہ نمبر ۲ کے بعد آنا چاہیئے۔ میری کمیٹی ان تمام کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھے گی جو مرکزی دفاتی خدمات کے امیدواران مشرقی بنگال کے

اس اندیشے کو رفع کرنے میں عمل میں لائی جائیں گی کہ اردو میں ان کی مبینہ کمزوری ان خدمات کے امتحانات مقابلہ میں مزاحم ہوگی۔ بلکہ ان کو اس بات کا اختیار دینا چاہیئے کہ وہ چاہیں تو امتحانی سوالات کے جواب بنگالی میں لکھیں
فقرہ نمبر ۴ کے آخر میں الفاظ
(اُردو کے بدل کے طور پر) بڑھا دیئے جائیں۔

فقرہ نمبر ۵ سے اتفاق ہے۔

فقرات نمبر ۳، ۶، ۷، ۸۔

میری کمیٹی کی رائے میں انگریزی کو بیس سال تک بطور سرکاری زبان کے رکھنا غیر معقول اور لغو ہے۔ اس سے وہ ساری تجویز جو زیر غور ہے غیر حقیقی ہو جائے گی۔ جب کہ تمام آزاد ملک اپنی زبان استعمال کرتے ہیں۔ جن میں سے بعض اُردو کے مقابلہ میں بہت پسماندہ ہیں، تو پاکستان کیوں ایک غیر ملکی زبان کے جُوئے کے نیچے دَبا ہوا رہ سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ایسا اعلان عام طور پر لوگوں میں یاس و حرمان پیدا کرے گا۔ اور عوام اور ارباب حکومت میں ناقابلِ عبور فصل قائم کر دے گا۔ میری کمیٹی اس سے کبھی اتفاق نہیں کر سکتی اور یہ درخواست کرتی ہے کہ فوراً ایک بااختیار اعلا پایہ کا کمیشن مقرر کیا جائے۔ جو اس مسئلہ پر غور کر کے اپنی سفارش حکومت میں پیش کرے کہ انگریزی کی بجائے کس زبان کو ہونا چاہیئے۔ یہ کمیشن سردار عبد الرب نشتر اور حکومت اور یونیورسٹیوں اور انجمن ترقیٔ اُردو کے نمایندوں پر مشتمل ہوگا۔ وہ تمام ان دعاوی اور مطالبات وغیرہ پر غور کرے گا جو مختلف اداروں اور جماعتوں کی جانب سے پیش ہوں۔ نیز اُن اعلانات و بیانات کو بھی دیکھے گا جو ممتاز شخصیتوں کی طرف سے جاری ہوئے ہوں۔ اس کے بعد جہاں تک جلد ممکن ہو پاکستان کے بہترین مفاد اور

سالمیت کو پیش نظر رکھ کر اپنی سفارشیں وفاقی سینٹ (ایوان بالا) میں پیش کریگا اور اُن ضروری تدابیر و ذرائع کا اظہار کرے گا جو انگریزی زبان کی بجائے قومی زبان کو متمکن کرنے کے لئے مناسب ہوں۔ میں پھر ایک بار پوری قوت کے ساتھ اس امر پر زور دیتا ہوں کہ جب تک بلا تاخیر مزید فوراً ان تجاویز پر عمل نہ کیا جائے گا اُس وقت تک ہرگز کوئی توقع نہیں کہ عام رائے حکومت کی لسانی پالیسی سے موافقت کرے۔

میرے اس تنقیدی نوٹ کے بعد انھوں نے اپنی تجاویز میں تبدیلی کی اور مندرجۂ ذیل نیا ضابطہ (فارمولا) پیش کیا:۔

۱۔ مغربی علاقے کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور مشرقی علاقے کی بنگالی۔

۲۔ پارلیمنٹ کے ارکان کو انگریزی کے علاوہ اُردو اور بنگالی میں بھی تقریریں کرنے کا حق ہوگا۔

۳۔ دستور کے نفاذ کے آغاز سے پندرہ سال تک انگریزی زبان اُن تمام سرکاری اغراض کے لئے استعمال ہوتی رہے گی جن کے لئے وہ دستور سے فوراً قبل استعمال ہوتی رہی۔

۴۔ مرکزی خدمات کے امتحان کے لئے اُردو اور دوسری صوبائی زبانوں کا درجہ مساوی ہوگا۔

۵۔ حکومت ایک مشترک قومی زبان کے نشو و نما کے لئے تمام مناسب تدابیر اختیار کرے گی۔

۶۔ پانچ سال کے اندر ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ جو انگریزی کی بجائے اس کی قائم مقام زبان کے بارے میں سفارش کرے گا۔

۷۔ باوجود مندرجۂ بالا دفعات کے وفاقی مجلس وضع قوانین بذریعہ قانون

آغاز دستور سے پندرہ سال منقضی ہونے کے بعد بھی ایسے اغراض کے لئے جس کی تصریح قانون میں کردی گئی ہو انگریزی کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے۔

اس ضابطے پر غور کرنے کے بعد میں نے کہا کہ اس کی بعض دفعات سے ہمیں اختلاف ہے۔ اور ہم اس ضابطے کی بھی مخالفت کریں گے۔ لیکن یہ ضابطہ پہلے سے بہتر ہے اور آپ اسے مجلس دستور ساز میں منظوری کے لئے پیش کرسکتے ہیں۔

ان تمام مذاکرات کے بعد اگرچہ ہمیں اپنے مقصد میں پوری کامیابی نہیں ہوئی اور ہم قائد اعظم علیہ الرحمۃ کے ناطق فیصلے کے مطابق اُردو کو پاکستان کی زبان منوانے سے قاصر رہے۔ تاہم ہمیں ایک گونہ یہ اطمینان تھا کہ کم سے کم پاکستان کا ایک وسیع علاقہ تو ایسا ہوگا جہاں کی سرکاری اور قومی زبان اُردو ہوگی۔ اُردو نگھری نہیں رہے گی۔ اس کا ایک مستقل ٹھکانا اور مقام ہوگا۔ لیکن نہایت افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ پاکستان کے عالی مرتبت وزیر اعظم نے اس معاہدۂ واثق کے خلاف جو انھوں نے اپنے دو معزز وزیروں کی معیت میں مجھ سے اور میرے رفقا سے کیا تھا۔ مجلس دستور ساز میں ۱۷ مئی ۱۹۵۴ء کو وہی پہلا فرسودہ ضابطہ پیش کیا جسے ہم رد کرچکے تھے اور جس کے نقائص تسلیم کرکے انھوں نے خود اس میں مناسب تبدیلی کی تھی۔ زیادہ افسوس اس کا ہے کہ وہ دو معزز وزیر جو ان کے چپ و راست تشریف فرما تھے اور جن کے مشورے سے نیا فارمولا تیار ہوا تھا۔ وزیر اعظم کی تجویز اور تقریر چپ بیٹھے سنتے رہے اور یہ کہنے کی توفیق نہ ہوئی کہ ہم نے جو فارمولا تجویز کیا تھا اور جسے ہمارے اصرار پر صدر انجمن ترقی اُردو اور اُن کے رفقا نے بھی مان لیا تھا وہ یہ نہیں ہے۔ انھیں کچھ بھی اپنی

بات کا پاس نہ ہوا۔ قول اور فعل میں اس قدر تفاوت حیرت انگیز ہے۔

مجلس دستور ساز میں جناب وزیر اعظم نے زبان کے رد کردہ ضابطے (فارمولا) کو پیش کرتے وقت اپنی تائید میں انھیں پامال دلیلوں کا اعادہ کیا جو مسئلہ زبان کی بحث میں بار بار پیش ہوئیں اور ہر بار ان کی تردید کی گئی۔ ان کی سب سے قوی دلیل جسے وہ بارہا بڑے فخر اور قوت سے پیش کرتے ہیں وہ بعض ایسے ملکوں کی مثال ہے جہاں ایک سے زیادہ زبانیں استعمال میں ہیں۔ ان مثالوں کو پیش کرتے وقت انھوں نے کبھی اس امر پر غور نہیں کیا کہ ان مثالوں کا پاکستان پر اطلاق نہیں ہوتا۔ ان کی بہت ہی محبوب مثال کنیڈا کی ہے جہاں وہ خود بھی کچھ عرصہ مقیم رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو ملک اس وقت کنیڈا کہلاتا ہے پہلے وہاں فرانسیسی پہنچے اور انھوں نے اپنی نوآبادی (کالونی) بسائی۔ انگریز بعد میں پہنچے۔ اور غالب آگئے۔ یہ دو قومیں الگ الگ ہیں جن میں ہمیشہ رقابت رہی۔ یورپ میں، ہندوستان میں، نیز کنیڈا میں۔ اس لئے وہاں دو زبانوں کا ہونا لازم تھا۔ اوائل گذشتہ صدی تک فرانسیسی بین قومی (انٹرنیشنل) زبان تھی۔ تمام معاہدے اور صلحنامے اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ ترکی، ایران، مصر و مشرق وسطیٰ میں فرانسیسی انگریزی سے زیادہ عام ہے۔ گذشتہ صدی سے انگلینڈ اور امریکا کا سیاسی اقتدار بڑھنا شروع ہوا اس لئے انگریزی زبان نے بھی وہی قوت اور اقتدار حاصل کر لیا جو فرانسیسی کو حاصل تھا۔ اس لئے کنیڈا میں ان دونوں کو سرکاری زبان بنانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی پھر دونوں کا رسم خط یکساں ہے اور دونوں بین قومی زبانیں ہیں۔ بے چاری بنگالی کو یہ رتبہ کہاں حاصل ہے۔

دوسری مثال جو عام طور پر پیش کی جاتی ہے وہ روس کی ہے جو لوگ

اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ رُوس کی حالت سے واقف نہیں۔ رُوس کے جاننے کے لیے اسٹالین کا جاننا ضروری ہے۔ یہ بہت ہی بڑا شاطر اور پُر فراست شخص تھا۔ اس کے پیشرو کی پالیسی یہ تھی کہ وہ صوبائی عصبیت کو کچل کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسٹالن کا مسلک اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس نے اُن کی اشتہا مارنے کے لئے فاقے نہیں کرائے بلکہ اُن کو اس قدر کھلایا اس قدر کھلایا کہ وہ چھک گئے اور کھانے سے بیزار ہو گئے۔ اس اصول پر اس نے بغیر کسی روک ٹوک کے ہر علاقے کو اپنی زبان استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور مرکز کی زبان رُوسی رکھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اکثر علاقوں نے اپنی زبانیں چھوڑ چھاڑ کر روسی زبان اختیار کرنی شروع کر دی۔ آسانی اور فائدہ اسی میں دیکھا اس ضمن میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اسٹالن خود بھی گرجستانی (جارجین) تھا اور ١٩١٩ء میں بالشویک گرجستانیوں کا ایک وفد پیس کانفرنس پیرس میں حاضر ہوا اور مطالبہ کیا کہ ہمیں ایک الگ غیر رُوسی قومیت تسلیم کیا جائے۔ اُن کے دعوے کی بنیاد یہ تھی کہ اُن کی گرجی زبان ایک خاص الگ زبان ہے۔ ان کے ساتھ ایک ترجمان بھی تھا جس کا فرض منصبی یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ ان کی عجیب و غریب زبان کا ترجمہ فرانسیسی میں کرے گا۔ ایک موقع پر ایک انگریز صحافی نے، جو اتفاق سے روسی زبان جانتا تھا (گرجستانیوں کو اس کا علم نہ تھا) یہ دیکھا کہ وہ گرجستانی اور ان کا ترجمان آپس میں روسی زبان میں بات چیت کر رہے ہیں۔ غرض یہ کہ اگر روسی زبان جبراً اُن پر ٹھونپی جائے تو وہ بلا قصد غیر شعوری طور پر اپنی ساری سیاسی گفتگو روسی زبان میں کریں گے (ٹائن بی اسٹڈی آف ہسٹری) مجھے اپنے ملک میں ایسے تماشے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

اس تقریر میں ہمارے سابق وزیر اعظم صاحب نے اردو کے متعلق جن خیالات

کا اظہار فرمایا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ نفس انسانی کے مطالعہ کے لئے بیش قدر افکار بہت کار آمد ہو سکتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں :-

"یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے کہ ہم بنگالی یعنی مشرقی بنگال کے مسلمان اُردو سے عداوت رکھتے ہیں یا اسے ناپسند کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اُردو ہمیں نہایت عزیز ہے اور ذاتی طور پر اُردو کی محبت واحترام میں میں کسی سے کم نہیں۔ ہم اُردو کی اس اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں کہ اس زبان میں ہمارے نظریاتی، مذہبی اور تہذیبی افکار کا بہتر اور صحیح طور سے اظہار ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں اُردو کی جو محبت اور احترام ہے اُس میں میں کسی سے کم نہیں۔ اگرچہ میری مادری زبان بنگالی ہے لیکن میں نے اس زبان کو کبھی نہیں پڑھا۔ زمانۂ شیرخوارگی سے بی۔ اے کے درجے تک اُردو میری مثل مادری زبان کے تھی۔ میں نے یونی ورسٹی کے امتحانات میٹریکولیشن، انٹرمیڈیئٹ، بی اے اُردو زبان میں پاس کئے۔ گویا میری مختار مادری زبان اُردو ہے اگرچہ میری اصلی مادری زبان بنگالی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے اکثریت کی آڑ لی ہے۔ اور جمہوریت کے اصول کا رُعب ڈال کر اپنے دعوے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو زبانوں یعنی اُردو اور بنگالی کے سرکاری زبان ہونے سے ایک فائدہ یہ بتایا ہے کہ ان کے میل سے ایک قومی زبان وجود میں آئے گی (گویا زبانیں اسی طرح بنتی ہیں) اور چونکہ قومی زبان کے بننے اور نشوونما میں دیر لگے گی اس لئے بیس سال تک انگریزی سرکاری زبان رہے گی اور ضرورت ہوئی تو اس سے زیادہ مدت تک بھی آخر میں نہایت دیدہ دلیری سے پاکستان کی سالمیت اور پاکستان کی وحدت و استحکام

کی دہائی دی ہے اور اصحاب اخبارات اور عوام سے التجا کی ہے کہ وہ اس فارمولے کو بغیر مخالفت اور احتجاج کے منظور کر لیں اور اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کی دعا پر اپنی تقریر دلپذیر کا خاتمہ فرمایا ہے۔

وزیر اعظم صاحب کی تقریر کے بعد خان عبد الغفار خان صاحب نے فرمایا۔

"جناب پریزیڈنٹ صاحب! میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ صوبائی زبانوں کے متعلق تشریح فرما دیں۔ سنٹر میں آپ خواہ ایک زبان مقرر کریں یا دو اس سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں۔ صرف یہ امر واضح کر دیا جائے کہ صوبوں میں جو ہماری مادری زبانیں مروج ہیں آیا ان میں ہم اپنے بچوں کی تعلیم جاری رکھ سکیں گے اور صوبائی عدالتوں میں ان کا استعمال برقرار رکھا جانے کی اجازت ہوگی یا نہیں۔"

وزیر اعظم محمد علی صاحب نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ اگر کوئی صوبہ اپنی زبان کو سرکاری زبان بنانا چاہے گا تو اس کی صورت یہ ہوگی کہ صوبہ کی مجلس وضع قوانین صوبہ کے گورنر سے سفارش کرے گی کہ یہ زبان سرکاری زبان قرار دی جائے۔ جب صوبہ کا گورنر یہ سفارش قبول کر لے گا تو یہ زبان سرکاری زبان تسلیم کر لی جائے گی۔ غرض تمام صوبے مختار ہیں کہ وہ اپنے سرکاری کاروبار اور نظم و نسق کے لئے اپنی صوبائی زبانیں استعمال کریں۔

پیرزادہ عبد الستار صاحب نے اس تحریک کے محرک وزیر اعظم محمد علی کا شکریہ ادا کیا کہ ہماری زبان سندھی کا بھی شمار سرکاری زبانوں میں ہوگا۔ اس فارمولے کی بنا پر ہم تمام سرکاری معاملات اپنی زبان کے ذریعہ انجام دے سکیں گے۔ اور آئندہ سرکاری خدمات کے امتحانات میں سوالات کے جواب اپنی صوبائی زبانوں میں لکھ سکیں گے۔ اور سب زبانوں کا رتبہ مساوی ہوگا۔

خان عبد القیوم خان صاحب نے فرمایا کہ اس رزولیوشن سے پاکستان

کے اسی لاکھ پشتو بولنے والوں کے خواب کی تعبیر پوری ہوتی ہے۔ انھوں نے رزو لیوشن کے محرک کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا کہ اس قرارداد کی رو سے پٹھانوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوتی ہے جس کے لئے وہ اصرار کرتے رہے ہیں۔

مسٹر پی۔ ڈی بھنڈارا نے فرمایا کہ میں پاکستان کے استحکام و سالمیت کے مفاد کے مدنظر اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں۔

"زبان کے مسئلہ نے ہماری سیاسیات میں کچھ مدت سے ہلچل مچا رکھی ہے لیکن یہ مطلق توقع نہ تھی کہ یہ ایک ایسی زبردست صورت اختیار کرے گا جو اس کی بظاہر سادہ ہیئت سے اس قدر متضاد ہوگی اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ اس کے متعلق ایسے عام مظاہرے ہوں گے جو اب دیکھنے میں آرہے ہیں۔ یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ ایسے مظاہرے ملک میں اس وقت بھی نہیں دیکھے گئے جب کہ ملک قحط اور معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ ایسی شورش کبھی اس عام بداعمالی اور نااہلی کے خلاف عمل میں نہ آئی جو روزانہ ہماری معاشیات کو گھن کی طرح کھائی جارہی ہیں۔ بہت سی ایسی خرابیاں اور نقائص ہیں جو ہماری معاشیات اور تہذیب پر بری طرح اثر انداز ہیں۔ ان کے خلاف مظاہرے زیادہ ضروری ہیں۔ لیکن ہم ان سے آنکھیں بند کرلیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ لسانی مسئلہ کو اس قدر اہمیت دی گئی کہ دوسرے زیادہ اہم مسائل نظر سے اوجھل ہوگئے ہیں۔ اس کی وجہ تلاش کرنے کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس فساد کے ذمہ دار ہمارے مغربی اور مشرقی پاکستان کے سیاست داں ہیں۔ باوجودیکہ وہ روزانہ سالمیت، اخوت وحدت کی یقین دہانی اپنے بیانات کے ذریعہ کرتے رہتے ہیں لیکن

ان کا عمل اس کے خلاف ہے۔ انھوں نے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور دونوں پاکستانوں میں افتراق پیدا کر دیا ہے۔

وحدت اور استحکام کی خاطر ہم میں بہت سی باتیں مشترک ہونی چاہئیں۔ ان سب میں وحدت و یک جہتی کو ترقی دینے کے لئے سب سے زیادہ اہم اور ممتاز ذریعہ زبان کی وحدت ہے یعنی اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے ایک مشترک وسیلہ کا اختیار کرنا۔ سرکاری زبان کی دو شاخی تقسیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف سمتوں میں تقسیم اور تقسیم در تقسیم کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اور باہمی افہام و تفہیم میں خلل انداز ہوگا۔

وحدت و یک جہتی کی خاطر میں بنگالی دوستوں کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ وہ دو سرکاری زبانوں یعنی اُردو اور بنگالی کے مسئلہ پر نظر ثانی فرمائیں۔ بنگالی کا زبان کا مرتبہ عطا کرنا نامناسب ہوگا زیادہ سے زیادہ اسے بولی کہا جا سکتا ہے جو اُردو اور ہندی کی مولود ہے جو بنگال سے باہر شاذ و نادر ہی کہیں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اُردو میں ایک کامل زبان کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ یہی ایک ایسی زبان ہے جو کوہِ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس میں دُنیا کے اعلاترین ادیبوں اور فلسفیوں کے افکار موجود ہیں۔ یہ ایک ایسی زبان ہے جس میں انسان اپنے خیالات نہایت خوبی سے ادا کر سکتا ہے۔ بنگالی کے لئے بنگالیوں کا اصرار محض آبادی کی بنا پر ہے۔ اگر اس مسئلہ کے طے کرنے کا صرف یہی ایک معیار ہے تو وہ حق بجانب ہیں۔ مگر اس کے علاوہ اور بھی کئی قابل لحاظ اُمور ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اُمور

میں سے ایک مادۂ قبولیت ہے ۔ اور اس زاویۂ نظر سے دیکھا جائے تو اُردو بہت آسانی سے قبولیت پذیر ہے ۔ لہٰذا ملک کی کسی دوسری زبان یا بولی کے مقابلے میں اُردو سرکاری زبان بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے ۔

بعض غیر بنگالی جو بنگالی کی حمایت کرتے ہیں وہ تشفی کی مصلحت اور ایوان میں زیادتیٔ تعداد کی بنا پر ہے ۔ اس ناجائز دباؤ سے ۔ جو نتائج برآمد ہوں گے ان پر آیندہ نسلیں رنج والم کا اظہار کریں گی ۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر میرے بنگالی دوست ان امور پر پوری طرح غور کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ دو سرکاری زبانوں کے ہونے پر اصرار نہ کریں گے ۔ ورنہ ملک کی سالمیت کی بنیادیں متزلزل ہو جائینگی ملک کے اتحاد و استحکام کی خاطر میں واحد سرکاری زبان کے لئے پُرزور اپیل کرتا ہوں اور وہ زبان اُردو ہونی چاہیئے ۔"

سردار شوکت حیات خان ( پنجاب )

" جناب ! میں ( اس وقت ) ایک ایسے شخص کی طرح تقریر کرتا ہوں جس کی مادری زبان اُردو ہے اور جس نے اردو علی گڈھ جیسے مقام میں سیکھی ہے ۔ میں آج اُردو کی حمایت میں لڑنے کے لئے نہیں بلکہ اُس قرارداد کی تائید کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں جو عزت مآب وزیر اعظم نے پیش کی ہے ۔ ہم ہمیشہ اُردو بولتے رہے ہیں اور آئندہ نسلہا نسل تک یہی زبان بولیں گے ۔ اگرچہ اُردو سے مجھے بہت محبت ہے مگر پاکستان کی محبت اس سے کہیں زیادہ ہے ۔ میں اُردو کے نادان دوستوں میں سے نہیں ہوں جو اس کی حمایت میں اشتعال انگیز تقریریں کر کے اُسے

نقصان پہنچاتے ہیں۔ میں مشرقی پاکستان گیا ہوں اور میں نے زبان کے مسئلہ میں مشرقی پاکستانی بھائیوں کے جذبات کو دیکھا ہے۔ یہ بات میں آج نہیں کہتا ہوں اور نہ الیکشن کے دنوں میں کہی بلکہ اس سے بہت قبل ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء کو کہی جب کہ یہ معاملہ ایوان میں آیا میں پہلا شخص تھا جس نے اُس وقت کی حکومت اور سربراہوں (لیڈروں) کو جو اس وقت اسمبلی میں بیٹھے ہیں نصیحت کی تھی کہ وہ شترمرغ کی طرح آنکھیں نہ بند کرلیں اور اس بڑے مسئلہ کو ملتوی کرکے نظرانداز نہ کریں لیکن انھوں نے میری بات نہ سنی۔ وہ تقریر میرے پاس اس وقت موجود ہے جو کامل طور سے اس مسئلہ کو واضح کرتی ہے اور جس نے اس امر کی تائید کی کہ بنگالی بھی ایک سرکاری زبان ہونی چاہیئے لیکن ہمارے لیڈروں نے اس کی پروا نہ کی اور اس کا نتیجہ وہ فساد ہوا جو مشرقی پاکستان میں واقع ہوا اور اس کی وجہ سے جو جذبات مشرق اور مغرب میں مشتعل ہوئے وہ پاکستان کے اتحاد و استحکام کے حق میں بہت تباہ کن ہیں۔ بہ نسبت ایک واحد سرکاری زبان کے جس کے لئے ہم لڑ رہے ہیں۔ اس بنا پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ہم پاکستان کی وحدت اور سالمیت کو خطرہ میں ڈالیں خواہ ہمارے جذبات زبان کے متعلق کچھ بھی ہوں اور کوئی زبان بھی ہو یہ بہت چھوٹی بات ہے۔ اس کی خاطر ہم پاکستان کو کیوں پاش پاش کریں

ہم اُن لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ممنون ہیں۔ جنھوں نے پاکستان کے لئے اپنی جانیں دیں؟ ہم ممنون ہیں جمہوریت کے سادہ اصولوں کے کہ اتنے سارے لوگ زبان کی ثنویت کے لئے لڑ جھگڑ رہے ہیں

نیز ہم حکومت کے وفاقی نظام کے ممنون ہیں جہاں سمجھوتے کا عمل جاری ہے کہ ہم مشرقی پاکستان کے بھائیوں کے مطالبہ کو قبول کر لیں۔ اب باہم ایک سمجھوتہ ہونا چاہیئے جس کی رُو سے ہم باہم مل سکیں۔ بات چیت کر سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں؟ اور وہ دن جلد آئے جب کہ ہم ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھنے کے قابل ہوں تاکہ ایک مشترک زبان ایسی پیدا ہو جو حقیقت میں پاکستان کی زبان ہو جسے ہماری آئندہ نسلیں استعمال کریں گی۔"

اس کے بعد قرارداد منظور ہو گئی۔

مجلس دستور ساز کی یہ کارروائی عجیب و غریب ہے۔ وہ مسئلہ جو ایک صدی سے زیر بحث رہا ہے۔ جس کے بارے میں بڑے بڑے بحث مباحثے اور معرکے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں انگریزی حکومت اور کانگریس کی حکومتوں سے لڑنا پڑا اور جسے ہم نے جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ وہ مسئلہ جب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوتا ہے تو ایک صاحب محرک کی تائید کرتے ہیں۔ ایک صاحب اس موقع کو غنیمت سمجھ کر وزیر اعظم کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان کی قرارداد کی بدولت سندھی کو بھی سرکاری زبان ہونے کی عزت حاصل ہو جائے گی۔ پنجاب کے ایک رکن قرارداد کی حمایت میں پُر زور تقریر کرتے ہیں۔ صرف ایک صاحب مسٹر بھنڈارا (پنجاب) نے قرارداد کی مخالفت کی اور بس۔ لیجیئے قرارداد منظور ہو گئی۔ محرک کو چھوڑ کر باقی تین صاحبوں کی تقریریں صرف چند چند سطروں کی تھیں۔ یہ حشر ہوا اس اہم اور بنیادی مسئلہ کا جس پر اس قدر کہا گیا اور لکھا گیا ہے کہ اگر اُسے جمع کیا جائے تو ایک چھوٹا سا کتب خانہ بن جائے۔ اس مجلس میں قومی زبان کے جاں نثار اور شیدائی بھی تھے، قائد اعظم کے معتقد اور پیرو بھی تھے۔ لیکن کسی کو یہ توفیق

نہ ہوئی کہ اس غیر معقول وحدت کش قرارداد کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔ اخلاقی جرأت کا فقدان اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس قرارداد کے منظور ہوتے ہی ہر طرف سے تقاضا ہوا کہ میں اس کے متعلق اپنا بیان دوں۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل بیان اخباروں کو دیا:-

(اُردو زبان ہی پاکستان کی بنا کا باعث ہوئی۔ یہ زبان ہماری زندگی کا جُزا اور تہذیب و قومیت کی بنیاد ہے)

"زبان کے متعلق جو ضابطہ (فارمولا) مسلم لیگ پارٹی نے تجویز کیا اور جسے بعد میں مجلس دستور ساز نے پاس کیا بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ مجوزین نے اسے بڑی ہوشیاری اور حکمت سے مرتب کیا ہے اور ایک ایک لفظ اس طرح تول تول کر رکھا ہے کہ اُردو زبان خود بخود اتنی کمزور ہو جائے کہ پاکستان میں کہیں اس کے قدم نہ جمنے پائیں۔ اس کوشش میں سارا ضابطہ (فارمولا) مبہم، متضاد اور مہمل ہو کر رہ گیا ہے۔

ضابطے کی پہلی دفعہ میں پاکستان ری پبلک کی سرکاری زبانیں دو قرار دی گئی ہیں۔ ایک بنگالی دوسری اُردو۔ یہ ہمارے لئے قطعاً ناقابلِ قبول ہے۔ دو ایسی زبانوں کو یکجا کرنا جو اپنے باطن اور ظاہر کی رُو سے ایک دوسری سے متضاد ہیں ایک انمل بے جوڑ بات ہے۔ بنگالی کا رسم خط ناگری یا سنسکرتی ہے اور اُردو کا رسم خط عربی۔ بنگالی بائیں طرف سے لکھی جاتی ہے اور اُردو دائیں طرف سے۔ بنگالی نے بنگال کے نامور ادیبوں اور شاعروں کے آغوش میں پرورش پائی ہے۔ اور اُردو نے اسلامی تہذیب و روایات میں۔ بنگالی زبان کی تشبیہات،

استعارات، تلمیحات اور قصے کہانیاں بیشتر ہندو دیو مالا سے ماخوذ ہیں اور اُردو زبان کا یہ ذخیرہ عربی، فارسی زبانوں اور اسلامی مذہب و تہذیب پر مبنی ہے۔

اس ضمن میں یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ انگریزی عہد میں جب فارسی کی جگہ اردو سرکاری زبان قرار پائی تو ایک صدی تک تقریباً سارے ملک میں دفتروں، عدالتوں اور عام تعلیم کی زبان اُردو ہی رہی۔ قبل تقسیم کے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کا سب سے بڑا مابہ النزاع مسئلہ اُردو زبان تھا۔ یہ تنازعہ استی سال تک جاری رہا۔ سر سید احمد خاںؒ آخر دم تک اردو کی حمایت میں لڑتے رہے۔ کانگریس حکومتوں اور گاندھی جی سے مسلسل اسی مسئلہ پر مباحثے اور معرکے ہوئے۔ اگر ہندی اُردو کے تنازعہ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دو قومی نظریہ اُردو کی بدولت وجود میں آیا۔ اس لئے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت میں سب سے اول اُردو ہی پاکستان کی بنا کی باعث ہوئی۔ تقسیم کے وقت بھی دوست دشمن سب کا یہی خیال تھا کہ اسلامی مملکت یعنی پاکستان کی زبان اُردو ہی ہوگی۔ چنانچہ تقسیم کے فوراً بعد سی پی کے وزیر اعظم مسٹر شکلا اور یو پی کے وزیر اعظم پنڈت پنت نے اپنی تقریروں میں صاف طور سے یہ کہا کہ اس زبان کو ہم اپنے ملک میں نہیں رہنے دیں گے کیونکہ اسی نے پاکستان بنایا ہے۔ ہمارا مطالبۂ پاکستان بھی اس پر مبنی تھا کہ ہم اپنے مذہب، تہذیب اور زبان کی حفاظت کر سکیں۔ اسی وجہ سے پاکستان کے بانی قائد اعظمؒ نے نہایت پر زور اور غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کیا کہ " پاکستان کی زبان اُردو

اور صرف اُردو ہی ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہو سکتی !!"

ہم اس فرمان کے سختی سے پابند ہیں اور اس سے انحراف کرنے کو پاکستان سے غداری خیال کرتے ہیں۔

اس دفعہ میں ایک اضافہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ صوبہ کی مجلس وضع قوانین کی سفارش پر صدر مملکت صوبے کی زبان کو صوبے کی سرکاری زبان قرار دے سکتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ صوبوں میں سرکاری زبانیں صوبائی زبانیں ہوں گی اور مرکز کی زبان انگریزی ہوگی اُردو کہیں کی بھی زبان نہ ہوگی۔ اس لئے ہم ضابطے کی اس دفعہ کو کسی حالت میں بھی قبول نہیں کر سکتے اور اسے ہم پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کے منافی خیال کرتے ہیں۔ اس کے تسلیم کرنے سے پاکستان کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، کوئی علاقائی یا صوبائی زبان سارے پاکستان کی زبان نہیں ہو سکتی۔

- انگریزی زبان کو بیس سال تک پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینا نہایت لغو تجویز ہے۔ تمام آزاد ملک اپنی زبان استعمال کرتے ہیں۔ پاکستان کیوں ایک غیر زبان کی غلامی برداشت کرتا رہے۔ اس عمل سے ملک میں عارضہ کمتری اور محرومی اور مایوسی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اور حکومت اور عوام کے تعلقات میں کوئی رابطہ قائم نہیں ہو سکے گا اور پہلے سے زیادہ ایک دوسرے سے دُور ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ تجویز ہمارے لئے ناقابلِ قبول ہے۔

دفعہ ۵ کی رُو سے تمام ثانوی مدارس میں عربی اُردو اور بنگالی کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ تاکہ طالب علم علاوہ اس زبان کے جو

ذریعۂ تعلیم ہے ان میں سے ایک یا دو زبانیں لے سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام طور پر بنگال اور سندھ وغیرہ میں طالب علم عربی لیں گے۔ اور اُردو کا کوئی نام نہ لے گا۔ غرض یہ سب تجویزیں ایسی ہیں جن سے اُردو پر بڑی کاری ضرب پڑتی ہے۔

ایک تجویز یہ ہے کہ حکومت مشترک قومی زبان کی نشوونما اور ترقی کے لئے تمام ضروری تدابیر اختیار کرے گی لیکن جب تک یہ طے نہ ہو کہ مشترکہ قومی زبان کونسی ہے اس قسم کے بیانات اور توقعات کا اظہار بے معنی ہے۔ اور دستور کے آغاز سے دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو یہ سفارش کرے گا کہ انگریزی کے بجائے کونسی زبان ہونی چاہیئے۔ اس قسم کی تمام تجویزوں کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے ایسے مطالبات کو ٹالتے رہیں اور انگریزی بحالہٖ قائم رہے۔ ہم اسے تسلیم نہیں کرتے۔ کیوں نہ ایسا کمیشن فوراً مقرر کر دیا جائے تاکہ دستور کے تیار ہونے تک وہ اپنی سفارشات پیش کر سکے۔ اس سے بھی بڑھ کر مہمل تجویز یہ ہے کہ آغاز دستور سے بیس سال گزرنے کے بعد وفاقی مجلس وضع قوانین انگریزی زبان کی مدت میں اور توسیع کر سکتی ہے۔

اس ضابطہ پر غور کرنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جتنی تجویزیں اس میں پیش کی گئی ہیں وہ پاکستان کے حق میں نہایت مضر ہیں، اس سے ملک میں انتشار پھیلے گا، صوبائی تعصب بڑھے گا۔ خود غرض اور پاکستان دشمن گروہ کو نفاق و اختلاف پھیلانے کا موقع ملے گا اور پاکستان کی وحدت و سالمیت نابود ہو جائے گی۔ ان تجاویز کے شائع ہونے پر لوگوں میں سخت ہیجان پیدا ہوگیا ہے اور اس ہیجان میں اس خیال نے

اور اضافہ کر دیا ہے کہ یہ اقتدار طلب حضرات کے ذاتی اور خیالی مفاد پر مبنی ہے۔ صبح سے شام تک لوگ مجھ سے ملنے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اب کیا ہوگا؟ اس کے بعد کیا پروگرام ہوگا؟ اسی مضمون کے روزانہ بیسیوں فون اور خطوط وصول ہوتے ہیں۔ لوگوں میں ایک غیر معمولی جوش پایا جاتا ہے۔ اور وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں اپنے نصب العین کو پھر ایک بار صاف صاف بتانے کی ضرورت ہے۔

(۱) پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ایک ہوگی اور وہ بقول قائد اعظمؒ اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔ اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔

(۲) ایک سال کے اندر انگریزی زبان کے بجائے اُردو کو بٹھانے کا کام اس طرح شروع کیا جائے کہ دو سال میں تمام سرکاری دفتروں اور عدالتوں کے کام اُردو میں ہونے لگیں۔ اُردو میں اس کی کامل صلاحیت موجود ہے۔

(۳) ذریعہ تعلیم تمام مدارس اور یونیورسٹیوں میں اُردو قرار دیا جائے سنہ ۱۹۵۵ء میں شروع کر کے پانچ سال کی مدت میں تمام مراحل طے کرلئے جائیں اور اس کے لئے جس قسم کی کتابوں اور نصابوں کی ضرورت ہو اس عرصہ میں اس کی تکمیل کی کوشش کی جائے۔

(۴) نمبر ۲ و ۳ کے عمل میں لانے کے لئے انجمن ترقی اردو پاکستان ہر قسم کی مدد دینے کے لئے تیار ہے۔

(۵) اُردو یونیورسٹی کی تجویز کو عمل میں لانے کے لئے کافی سرمایہ جمع کیا جائے اور حکومت کو بھی اس میں فیاضانہ امداد دینی چاہیے۔

ان مقاصد کو عمل میں لانے کے لیے ہمیں ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں میں کام کرنے کے لئے مخلص کارکنوں کی جماعتیں تیار کرنی ہوں گی۔ یہ کام بغیر سرمائے کے تکمیل نہیں پا سکتا اور اب تک یہ اسی لئے نہ ہو سکا کہ انجمن میں استطاعت نہ تھی۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ ہم اس معاملے میں کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں۔ بنیادی اصولوں میں سمجھوتا نہیں ہوا کرتا۔ ہم اردو کو پاکستان کی سرکاری اور قومی زبان بنا کر رہیں گے کیونکہ اس برعظیم میں کوئی زبان اس قدر وسیع، پُرمایہ، ہمہ گیر، کارساز و کاربرار نہیں جیسی اُردو ہے اور اسی بنا پر ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ پاکستان کی اگر کوئی سرکاری زبان یا قومی زبان ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی جتنی باقی زبانیں یا بولیاں ہیں وہ مقامی یا علاقائی ہیں جن کی رسائی اپنے علاقے سے باہر نہیں۔ ہمیں علاقائی زبانوں کی خوبیوں سے انکار نہیں لیکن ظاہر ہے کہ کوئی علاقائی زبان پورے پاکستان کی زبان نہیں ہو سکتی۔ یہ اُردو ہی کا ظرف ہے کہ وہ اس برعظیم کے تقریباً ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ مملکتی زبان ہونے کا دعوا اسی کو سزاوار ہے۔ مسلم لیگ پارٹی اور مجلس دستور ساز اپنی تجویزیں حکومت میں پیش کیا کریں ہم ان کو نہیں مانیں گے۔ کیونکہ یہ خلاف انصاف خلاف عقل سلیم اور خلاف اُصولِ جمہوریت ہیں۔

ہم نے اس کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں اور آئندہ اس سے بھی زیادہ قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اُردو اب ہمارے لئے محض زبان نہیں رہی بلکہ یہ ہماری زندگی کا جزو اور ہماری تہذیب و قومیت کی

بنیاد ہے۔ یہ پاکستان کے مختلف عناصر اور فرقوں کو ایک رشتے
میں منسلک کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ اس سے جدا ہونا شائستگی اور
قومیت سے دست بردار ہو کر بربریت اور افتراق کی طرف جانا ہے
لہٰذا اب ہمیں اس کے لئے پوری قوت کے ساتھ جدوجہد شروع
کر دینی چاہیئے ''

حالات عجیب بے ہنگم طور سے بدل رہے تھے۔ اقتدار کے بھوکے سب کچھ
گوارا کر لیتے ہیں لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں ہوتا کہ ان کے اقتدار پر آنچ آئے۔ اس
کشمکش میں ہار جیت لازم ہے۔ گورنر جنرل نے اپنے اختیار سے بڑی جرأت کر کے
کابینہ کو توڑ پھوڑ ڈالا اور نئی کابینہ اور نئی مجلس دستور ساز بنا ڈالی اور دفعتہً
'' ون یونٹ '' کا بم اس طرح پارلیمنٹ میں لا کے پھینکا کہ کسی کو سوچنے کا موقع بھی
نہ ملا۔ اب مغربی پاکستان کو اس کے مختلف صوبوں اور ریاستوں کے حدود اور نشان
مٹا کر ایک وحدت میں بدل دیا گیا۔ اس میں بھی جیت مشرقی بنگال کی رہی۔ اس کا
صوبہ اکھنڈ رہا اور یہاں باوجود وحدت کے کھنڈت پڑ گئی۔ ہوس کے بندے اقتدار
کے بھوکے اعلا قوت کے ساتھ ہو گئے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہوئی۔ ڈھونڈ کر
ایک ایسے شخص کو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا جسے تدبّر سے کچھ واسطہ نہ تھا
اس نے چند روز نظام کی طرح چام کے دام چلائے اور اپنے منصب کو بٹا لگا کر
اپنے آقا کے ساتھ بساط سیاست سے پٹے ہوئے مہرے کی طرح روپوش ہو گیا۔
اس وزیر بے تدبیر نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور پھوٹ کا بیج بویا۔
باوجود مملکت پاکستان کے وزیر اعظم اور آل پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہونے
کے وہ مشرقی پاکستان میں بنگالی کی تبلیغ کرتا پھرا۔ محض اس نیت سے کہ آئندہ
الیکشن میں اُسے ووٹ ملیں اور اس کی وزارت قائم رہے۔ جس طرح اُس نے

اِس سے قبل مشرقی پاکستان میں لسانی ہنگامہ سے فائدہ اُٹھایا تھا۔ اسی طرح اُس نے اب پھر اس فساد کو جگا کر فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور خلاف وعدہ اور خلاف قرارداد باہمی وہی پہلا ضابطہ بطور تحریک مجلس میں پیش کر کے منظوری لے لی جس کا ذکر انہی اوراق میں ہو چکا ہے۔

اب ایک دوسرا نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ اور نئے گورنر جنرل نئے وزیر اعظم اور نئے وزرا کی سبھا قائم ہوتی ہے۔ ہر طرف دستور کی دُہائی ہے۔ گویا گزشتہ سات سال میں کچھ ہُوا ہی نہ تھا اور اب چند مہینے میں سب کچھ ہو جائے گا۔ وزیر اعظم کو دستور کی دُھن تھی۔ یہ قانون، سیاست، تدبُّر کا مسئلہ نہ تھا عزت آبرو کا معاملہ بن گیا تھا۔ اندر ہی اندر سمجھوتے ہونے لگے۔ دستور کا جلد سے جلد پاس کرانا مقدم ٹھیرا۔ اس میں اگر کسی بُنیادی مسئلہ پر ضرب پڑتی ہو تو پڑا کرے۔ اگر کوئی اصول ٹوٹتا ہو تو بلا سے۔ دستور پاس ہو جائے اور جلد پاس ہو جائے۔ بنگال کے سورما اس کمزوری کو سمجھ گئے اور انھوں نے وہی ڈھنگ اختیار کیا جو "سنگرام پریشد" نے ڈھاکے میں اختیار کیا تھا۔ انھوں نے دبانا شروع کیا اور وزیر اعظم اور ان کے ساتھی دبتے گئے۔ اور ہر طرح جو چاہا منوا لیا۔ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ کامیابی و ناکامی کا مدار تعداد پر ہے۔ جدھر زیادہ ہاتھ اُٹھ گئے وہی جیت گیا۔ جہاں دماغ نہیں ہوتا اخلاقی جرات نہیں ہوتی، جہاں ذاتی یا پارٹی کا مفاد مدنظر ہوتا ہے، جہاں شہرت یا ہردلعزیزی کی چاہت ہوتی ہے۔ جہاں جذبات سے زیادہ اور عقل و دانش سے کم بحث ہوتی ہے، جہاں خود اعتمادی اور قوت ایمانی کا فقدان ہوتا ہے۔ وہاں تعداد ہی غالب ہوتی ہے۔ یہ سب جانتے تھے کہ زبان کا مسئلہ مجلس دستور ساز میں ضرور آئے گا اور جلد آئے گا لیکن ہمارے محترم وزیر اعظم سے (جن کا احترام دوست دشمن سب کے دل میں ہے) نہ رہا گیا اور جذبۂ خوشنودی سے

بے تاب ہو کر قبل از وقت ایوان میں بلا تکلف اور بلا خوف ملامت ضمیر یہ اعلان فرما دیا کہ بنگالی بھی سرکاری زبان ہو گی۔ سب حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ دو چار دن کی بات تھی۔ آخر یہ مسئلہ مجلس دستور ساز میں آنا اور بحث ہونی۔ اُس وقت جو چاہتے کہتے۔ یہ عجلت کیوں؟ معلوم یہ ہوا کہ اسمبلی پارٹی میں اس مسئلہ پر باہم گفتگو، سمجھوتا اور راز و نیاز ہو گئے تھے۔ یہ ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء کی بات ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں دیر ہو جانے سے نئے رفیق بدگمان نہ ہو جائیں ان کو اطمینان دلانے اور معاملہ پکا کرنے کی خاطر قبل از وقت اعلان کر دیا۔ سیاست کے بہت سے منھ ہیں، جیسا وقت اور جیسی مصلحت ہوتی ہے ویسے ہی منہ سے کام لیا جاتا ہے اگرچہ یہ اعلان اُس وقت بالکل بے محل تھا لیکن شاید مصلحت کا تقاضا یہی ہو۔ یہ سیاسی رموز ہیں۔ ہر کوئی اسے نہیں سمجھ سکتا۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جب اُردو کے گلے پر چھُری پھرنے والی تھی ۱۶/ فروری ۱۹۵۶ء کو زبان کا مسئلہ مجلس دستور ساز میں پیش ہُوا۔ اصل تحریک یہ تھی۔

۱۔ وفاقی پاکستان کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ ہوں گی۔

اس شرط کے ساتھ کہ یوم نفاذ دستور سے بیس سال تک انگریزی زبان اُن تمام سرکاری اغراض کے واسطے استعمال ہوتی رہے گی جن کے لئے وہ یوم دستور سے بالکل قبل استعمال ہوتی رہی ہے۔ اور پارلیمنٹ قانون پاس کر کے بیس سال کے بعد بھی ایسے خاص اغراض کے لئے انگریزی کے استعمال کی اجازت دے سکتی ہے جن کا مذکور اس قانون میں ہو۔

۲۔ دس سال منقضی ہونے پر صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو انگریزی کی جانشین زبان کی سفارش کرے گا۔

۳۔ کوئی امر مانع نہ ہوگا اگر کوئی صوبائی حکومت بیس سال منقضی ہونے سے قبل ان دونوں زبانوں میں سے کسی ایک کو انگریزی کی بجائے سرکاری زبان قرار دے۔

اس میں جو ترمیمات مشرقی بنگال کے ارکان نے پیش کیں۔ یہ ہیں :-

۱۔ فقرہ (۱) میں بیس سال کی جگہ دس سال کئے جائیں۔

۲۔ فقرہ (۲) میں دس سال کی جگہ پانچ سال ہونے چاہئیں۔

۳۔ فقرہ (۲) کے آخری جملے میں "جانشین زبان" کی بجائے "جانشین اردو اور بنگلہ دو زبانوں" لکھا جائے۔

۴۔ فقرہ (۱) کا آخری جملہ ("پارلیمنٹ قانون پاس کرکے ...... الخ) خارج کر دیا جائے۔

ان ترمیمات میں ترمیم نمبر ۳ بالکل بے معنی ہے۔ تحریک میں نمبر ۲ کا مطلب یہ تھا کہ دس سال بعد ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا جو بعد غور کے سفارش کرے گا کہ انگریزی کی جگہ کونسی زبان لے گی۔ یہ ایک معقول اور ضروری بات تھی۔ ترمیم کے بعد اس کی صورت یہ ہوگی۔

"پانچ سال منقضی ہونے کے بعد صدر ایک کمیشن مقرر کرے گا جو انگریزی کی بجائے اردو اور بنگلہ دو زبانوں کی سفارش کرے گا۔"

اس صورت میں ترمیم لغو ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تحریک کے فقرہ اوّل ہی میں یہ قطعی فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ وفاقی پاکستان کی سرکاری زبانیں اردو اور بنگلہ ہوں گی پھر پانچ سال بعد کمیشن کی سفارش کے کیا معنی؟ اس ترمیم کی غایت اس اندیشہ پر مبنی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دس سال بعد جو کمیشن مقرر ہو وہ بعد تحقیق اردو کو انگریزی کا جانشین قرار دے دے۔ اس ترمیم سے مانی ہوئی اصلی قومی زبان کے

انتخاب کا جو قدرے قلیل سہارا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اور دس سال کی بجائے پانچ سال اس لئے تجویز کئے گئے کہ جن اصحاب کا حکومت پر قبضہ ہے انھیں کے سامنے انھیں کی منشا کے مطابق سارا معاملہ طے ہو جائے۔ اگر دس سال کی مدت رہی تو ممکن ہے کہ حکومت میں کوئی ایسا انقلاب آ جائے کہ اُردو کو اپنا اصلی اور قدرتی حق مِل جائے۔

لیکن سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور طفلانہ ترمیم یہ تھی کہ فقرہ (۱) میں جو یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ "وفاقی پاکستان کی سرکاری زبانیں اُردو اور بنگلہ ہوں گی"۔ اس میں لفظ بنگلا اول لکھا جائے اور اُردو اس کے بعد۔ یعنی بجائے "اُردو اور بنگلہ" کے "بنگلا اور اُردو" لکھا جائے۔ بنگلہ کا درجہ اول ہونا چاہیئے۔

لسانی مسئلہ کی تحریک ایک بنگالی ممبر نے کی اور اس تحریک کی تمام ترمیمیں اور ان ترمیموں کی تمام تائیدیں تمام تقریریں مشرقی بنگال کے معزز ارکان نے کیں۔ مجلسِ دستور ساز کی روداد پڑھنے کے بعد یہ خیال ہوتا ہے کہ گویا یہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی ہے۔ کیونکہ تحریک کرنے والے، ترمیمات کرنے والے، ترمیموں کی تائیدیں تقریریں کرنے والے سب بنگالی حضرات تھے۔ مغربی پاکستان کے کسی رکن نے اس بحث میں حصہ نہیں لیا۔ نہ تحریک کے متعلق کچھ کہا اور نہ کسی ترمیم سے اختلاف یا اتفاق کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب کو سانپ سونگھ گیا تھا یا بنگالے کے جادو نے ان کے ہوش وحواس معطل کر دیئے تھے۔ سب ترمیمیں منظور ہو گئیں کیونکہ تحریک کرنے والے، ترمیم کرنے والے، تائید کرنے والے وہ خود ہی تھے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گِلِ کوزہ

یک طرفہ فیصلہ تھا۔ پیش قاضی تنہا روی راضی آئی۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ ملی بھگت کا معاملہ تھا۔ سب کچھ پہلے ہی طے

ہو چکا تھا۔ اسمبلی کی کارروائی محض دکھاوے کے لیے تھی۔ مغربی پاکستان کے غیرت مند ارکان جو ہمارے جلسوں اور کانفرنسوں میں اُردو کی جاں نثاری اور پرستاری کا دم بھرتے تھے دم بخود بُت بنے بیٹھے رہے اور کوئی ایک بھی تو مُنہ سے نہ پھوٹا۔

مشرقی پاکستان کے معزز ارکان نے اپنی تقریروں میں دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ ایک تو طلبہ کی قربانی جس کا ذکر ہر مقرر نے بڑے شاندار الفاظ میں بار بار کیا ہے۔ یہ اشارہ اس لسانی تحریک کی طرف تھا جس کا ذکر ان اوراق میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں طلبہ نے جلوس نکالے، ہڑتال کرنے کی کوشش کی۔ پولیس نے جلوس کو منتشر کرنے کے لیے آنسو گیس چھوڑی، لاٹھی چارج کیا اور جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو گولی چلائی۔ اس میں چند طالب علم ہلاک ہو گئے۔ اس قسم کے ہنگامے اور قربانیاں کہاں نہیں ہوئیں۔ کچھ دن پہلے کراچی میں طلبہ کے ایک ہنگامے میں کئی طالب علم ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس وقت بھارت اور سیلون میں لسانی تحریک کے سلسلے میں جو ہنگامے ہو رہے ہیں اور قربانیاں کی جارہی ہیں ان کے سامنے ڈھاکہ والی قربانی کی کیا حقیقت ہے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ بنگالی کو سرکاری زبان کا درجہ اُس قربانی کی وجہ سے ملا بلکہ اصل حقیقت خود ان قربانی دینے والے طلبہ اور لسانی تحریک کے بانیوں نے صاف صاف بیان کر دی ہے جو آپ ان اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر حکومت تدبر اور سختی سے کام لیتی تو یہ تحریک رُک جاتی اور پھر کبھی اُبھرنے نہ پاتی۔ حکومت کی نااہلی، غفلت اور بے تدبیری کو دُعا دینی چاہیئے کہ بنگالی کو یہ دن نصیب ہُوا۔ مشرقی بنگال کے معزز ارکان جنھوں نے اس تحریک پر بڑے جوش وخروش سے تقریریں فرمائیں، ان میں

بعض وہ حضرات بھی تھے کہ جب یہ قربانی دینے والے طلبہ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لسانی تحریک کی تائید کی درخواست کی تو انھوں نے ان غریب طالب علموں کو دھتکار دیا اور سیدھے منہ بات نہ کی۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ انہی حضرات نے اسمبلی کے ایوان میں بلا تکلف بار بار ان طالب علموں کی قربانی کا ذکر بڑے فخر و مباہات سے فرمایا۔

ایک دوسری بات جس کا ہر مقرر نے بڑے شد و مد سے ذکر فرمایا وہ علاقائی زبانوں کے متعلق تھی۔ وہ بڑے مربیانہ انداز میں سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی زبانوں کی نشو و نما اور ترقی کی سفارش فرماتے رہے اور حکومت کو بھی اس طرف متوجہ کیا کہ وہ ان زبانوں کے بڑھانے اور ترقی دینے میں پوری پوری اعانت کرے۔ سندھی اور پشتو کے متعلق تو انھوں نے یہاں تک کہا کہ یہ خاصی ترقی یافتہ زبانیں ہیں۔ علاقائی زبانوں کی نشو و نما اور ترقی کو سب نے تسلیم کیا ہے اور کبھی کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ لیکن مشرقی بنگال کے معززارکان ان زبانوں کی تعریف کرنے پر ایک اور وجہ سے بھی مجبور تھے کہ خود ان کی زبان بھی ایک علاقائی زبان تھی، دوسرے ان زبانوں کی تعریف کرکے انھیں اردو کی قدر و قیمت بھی گھٹانی تھی۔ لیکن کسی نے یہ نہ کہا کہ سندھی اور پشتو کو بھی اردو بنگالی کی طرح پاکستان کی سرکاری زبان ہونا چاہیے۔ جب ایک علاقائی زبان پاکستان کی سرکاری زبان ہو سکتی ہے تو دوسری علاقائی زبانیں کیوں نہیں ہو سکتیں۔ علاقائی زبانیں سب برابر ہیں خواہ وہ چار کروڑ کی ہوں یا چار لاکھ کی۔ اس بارے میں اکثریت کا دعوا غلط ہے۔ یہ کیسی اکثریت ہے جسے اپنے گھر سے باہر اقلیت بھی نصیب نہیں بلکہ صفر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی ایسی زبان کو اردو کے مقابلہ میں لا کر کھڑا کر دینا سراسر نادانی ہے۔ یہ پاکستان ہی کی نہیں سالہے

برعظیم پاک و ہند کی مشترک زبان (لینگوا فرنیکا) ہے۔ اور اس کا شمار ایشیا کی اول درجے کی زبانوں میں ہے اور جسے اپنے محاسن کی وجہ سے آگے چل کر بین الاقوامی زبان کا درجہ حاصل ہونے والا ہے۔ اس کی قدر و قیمت ان چھچھوری باتوں اور ترمیموں سے کم نہیں ہو سکتی۔

یہ حشر ہوا ہماری قومی زبان کا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں۔ یہ بھی جائے عبرت ہے۔

وہ زبان جسے غیر، ہمارے دشمن، ایسٹ انڈیا کمپنی کے رہبر اور ان کے آقا کمپنی کے ڈائرکٹر اپنے مقبوضہ عملداری ہند میں سرکاری زبان بنانے پر مجبور ہوں۔

وہ زبان جسے نووارد انگریز نوجوانوں کو سکھانے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ ولزلی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا۔

وہ زبان جسے ہمارے اسلاف اور ہمارے ادیبوں، شاعروں اور علمانے اپنی پیہم کوششوں اور دماغی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی کاوشوں سے ایسا پُرمایہ اور وسیع بنایا کہ وہ دنیا کی شایستہ اور ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑی ہو سکتی ہے۔

وہ زبان جو برعظیم پاک و بھارت میں سب سے مقبول اور مشترک ہے۔ اور اس برعظیم سے باہر دور دور تک غیر ممالک میں بھی جا پہنچی ہے۔

وہ زبان جس میں سب سے اول صوفیائے کرام نے اپنے اصول و عقائد کی تلقین چاردانگ ہندوستان میں کی اور اسے فروغ دیا۔

وہ زبان جسے ہندوؤں، آریا سماجیوں، سکھوں، عیسائیوں نے اپنی مذہبی کتابوں کی اشاعت اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے استعمال کیا۔

وہ زبان جس میں اہل حدیث نے اپنے رسالے اور کتابیں لکھیں اور اپنے عقائد کی اشاعت کی۔

وہ زبان جسے سرسید احمد خاں نے جدید تعلیم اور قومی اصلاح کے لئے اختیار کیا اور جس کے ذریعے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی!

وہ زبان جس کی بدولت دو قومی نظریہ وجود میں آیا اور مسلمانوں میں قومیت کا احساس پیدا ہوا اور اُس تعمیر کی بنیاد میں پہلی خشت رکھی جو بعد میں پاکستان کے مبارک نام سے موسوم ہوئی۔

وہ زبان جس کی حمایت میں سرسیّد احمد خاں مرتے دم تک اُردو کے دشمنوں سے لڑتے رہے۔

وہ زبان جس کی خاطر نواب محسن الملک نے یوپی کے جابر گورنر سے ٹکّر لی۔

وہ زبان جس نے خلافت کی تحریک میں جان ڈال دی اور اس کا غلغلہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچا دیا اور ملک کی سیاست کی کایا پلٹ دی۔

وہ زبان جس کا نام لے کر مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اُسے اس برعظیم کی عام و مشترک زبان بنانے کی قرارداد منظور کی۔

وہ زبان جس کے تحفظ کے لئے انجمن ترقی اُردو کانگرس حکومتوں اور اُن کے ناخدا گاندھی جی سے معرکہ آرائیاں کیں اور مخالفوں کو نیچا دکھایا۔

وہ زبان جس نے پاکستان کا پیغام گھر گھر پہنچایا اور اس کا نام بچّے بچّے کی زبان پر جاری ہو گیا۔ یہ نعمت ہمیں اسی کی بدولت نصیب ہوئی۔

وہ زبان جس کی خاطر قائد اعظم علیہ الرحمہ نے جان جوکھوں میں ڈال کر

ڈھاکے کا پُرخطر سفر اختیار کیا اور نہایت صاف اور غیر مبہم الفاظ میں علی الاعلان یہ فرمایا کہ پاکستان کی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی۔

اُس زبان کو ہمارے تنگ نظر، کوتہ اندیش سیاست کار اپنی بے تہ سیاست پر قربان کرنا چاہتے ہیں۔ ہم ان کی قراردادوں سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی رکاوٹیں ہمارے کام میں تیزی پیدا کرتی ہیں۔ اُردو نے مخالفتوں میں پرورش پائی ہے۔ اس کا پایہ اس قدر مضبوط ہے کہ اس قسم کے طوفان و حوادث اسے اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔ ہم اپنی جدو جہد جاری رکھیں گے اور اب یہ کام خاص اصول اور منصوبے کے تحت انجام پائے گا۔ اعلاترین پایہ تک پہنچنے کے لئے ہمارے ادب میں جو کمی ہے اُسے پُورا کیا جائے گا۔ جو خامیاں ہیں اُن کی اصلاح کی جائے گی۔ دائرۂ تحقیق وسیع تر کیا جائے گا۔ ہر شعبے کو حتی الامکان ہمہ گیر بنانے کی کوشش کی جائیگی اور ہم اپنی ساری ذہنی، دماغی اور اخلاقی قوتیں اُس عظیم نصب العین کے حصول میں صرف کریں گے جسے ہم اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے ہیں۔ یعنی **اُردو یونی ورسٹی کا قیام** ۔ اُردو نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے۔ اس نے کبھی کوتاہی نہیں کی۔ کمی اور کوتاہی کبھی ہوئی تو ہماری طرف سے ہوئی۔ ہمارے سیاست دانوں اور ماہرانِ تعلیم کے دماغوں میں یونی ورسٹی کا غلط تصور ہے۔ وہ نقل کرنا جانتے ہیں اور نقل کر رہے ہیں۔ ان میں جدّت وجودت نہیں ہے۔ اس لئے وہ کسی ایسے خیال کی قدر نہیں کر سکتے جس میں عام روش سے ہٹ کر کوئی جدّت پائی جاتی ہو لیکن ہم بہی خواہانِ اُردو کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ یونی ورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی۔ یہ قومی زبان اور قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھے گی۔ اور

فروغ دے گی۔ اس کا سنگِ بنیاد ایک ایسے شخص کا دستِ مبارک رکھے گا جس کے آنے کا انتظار ہے ؎

عبدالحق

زیر نگرانی حامد علی ندوی انجمن پریس میں طبع ہوا